مستند علماء اہلسنت کی کتب سے ماخذ

شرح

حدیث قرطاس

دفاعِ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ

تدوین: زاہد افضال احمد نقشبندی

برائے ایصالِ ثواب

علامہ پیر سید منظور احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ

فیض الباری

علامہ محمد ابو الحسن سیالکوٹی

اردو ترجمہ

فتح الباری

ابن حجر العسقلانی

شرح صحیح بخاری

جلد ۱

فضیلۃ الشیخ حافظ محمد اسماعیل الخطیب   فضیلۃ الشیخ حافظ محمد اسماعیل اسد گوندلوی

بحسن اہتمام

عبد اللطیف ربانی مدیر

مکتبہ اصحاب الحدیث
حافظ پلازہ مچھلی منڈی
نیو اردو بازار لاہور
042-37321823
0301-4227379

ابن شہاب زہری ہے صدی کے سر پر ساتھ حکم عمر بن عبدالعزیز کے پھر زیادہ ہوئے تدوین پھر تصنیف اور حاصل ہوئی ساتھ اس کے خیر کثیر پس واسطے اللہ کے ہے سب تعریف۔ (فتح)

١١١ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنِي ابْنُ وَهْبٍ قَالَ أَخْبَرَنِي يُونُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ قَالَ ائْتُونِيْ بِكِتَابٍ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوْا بَعْدَهُ قَالَ عُمَرُ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللّٰهِ حَسْبُنَا فَاخْتَلَفُوْا وَكَثُرَ اللَّغَطُ قَالَ قُوْمُوْا عَنِّيْ وَلَا يَنْبَغِيْ عِنْدِي التَّنَازُعُ فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ كِتَابِهِ.

١١١۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سخت ہوگئی اور درد غالب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس کاغذ لاؤ کہ میں تم کو نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی نہ بہکو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درد غالب ہے یعنی آپ بیہوش ہوئے ہیں اب یہ موقوف رکھا جائے اور ہمارے پاس قرآن موجود ہے وہ ہم کو کافی ہے پس اختلاف کیا صحابہ نے آپس میں اور بہت شور وشغب پڑ گیا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے پاس جھگڑنا لائق نہیں پس ابن عباس رضی اللہ عنہما نکلے کہتے ہوئے مصیبت کل مصیبت وہ حال ہے کہ مانع ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کاغذ لکھنے سے۔

فائدہ: مراد کتاب سے دوات اور مونڈھے کی ہڈی ہے اس واسطے کہ وہ اس میں لکھا کرتے تھے اور یہ جو کہا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درد غالب ہے یعنی دشوار ہوگا لکھنا نوشتہ کا مباشرت نوشتہ کی اور گویا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے سمجھا کہ وہ تقاضا کرتی ہے درازی کو قرطبی وغیرہ نے کہا ہے اِئْتُوْنِیْ امر ہے اور تھا حق مامور کا یہ کہ جلدی کرے ساتھ بجا لانے کے لیکن ظاہر ہوا واسطے عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک گروہ کے کہ امر وجوب کے واسطے نہیں بلکہ وہ باب ارشاد سے ہے طرف اصلح کی تو انہوں نے مکروہ جانا یہ کہ تکلیف دیں آپ کو اس سے وہ چیز کہ دشوار ہو اوپر آپ کے اس حالت میں باوجود ظاہر جاننے اس کے کی اس آیت کو ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾ اور اس آیت کو ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ یعنی نہیں قصور کیا ہم نے قرآن میں کسی چیز سے اور وہ بیان ہے واسطے ہر چیز کے اور اسی واسطے عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم کو اللہ کی کتاب یعنی قرآن کافی ہے اور ظاہر ہوا واسطے دوسرے گروہ کے کہ اولیٰ یہ ہے کہ لکھا جائے واسطے اس چیز کے کہ اس میں ہے حکم کے بجالانے سے اور یہ جو آپ نے فرمایا کہ یہاں سے اٹھ جاؤ تو اس نے دلالت کی اس پر کہ پہلا امر آپ کا اختیار پر تھا اسی واسطے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد کئی دن زندہ رہے اور پھر ان کو اس کا حکم نہ کیا اور اگر واجب ہوتا تو نہ چھوڑتے اس کو واسطے اختلاف ان کے اس واسطے کہ نہیں چھوڑی آپ نے تبلیغ واسطے مخالفت اس

شخص کے جو مخالف ہوا اور تحقیق تھے اصحاب مراجعت کرتے آپ سے بعض امروں سے جب تک کہ نہ جزم کرتے ساتھ امر کے پھر جب جزم کرتے تو اصحاب اس کو بجالاتے اور اس کی بحث آئندہ آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ لکھنے سے کیا مراد ہے سو بعض کہتے ہیں کہ مراد آپ کی یہ تھی کہ جو جو لوگ آپ کے بعد خلیفہ ہوں گے اُن کے نام صاف صاف لکھ دیں تا کہ ان کے درمیان خلاف واقع نہ ہو یہ قول سفیان بن عیینہ کا ہے اور اس کی تائید کرتا ہے یہ کہ حضرت ﷺ نے اپنی مرض الموت کی ابتدا میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اپنے باپ اور بھائی کو بلا تا کہ میں نوشتہ لکھ دوں اس واسطے کہ میں ڈرتا ہوں کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے اور کہنے والا کہے اور انکار کرتا ہے اللہ اور ایماندار مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اور واسطے بخاری کے اس کے معنی ہیں اور باوجود اس کے پس نہ لکھا اور پہلا قول ظاہر تر ہے واسطے قول عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کہ ہم کو اللہ کی کتاب کافی ہے باوجودیکہ وہ دوسری وجہ کو بھی شامل ہے اس واسطے کہ وہ اس کے بعض افراد ہیں۔

فائدہ: خطابی نے کہا کہ سوائے اس کے نہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ اس طرف گئے کہ اگر صاف بیان کرتے وہ چیز کہ دور کرے خلاف کو تو البتہ باطل ہو جاتی فضیلت علماء کی اور گم ہو جاتا اجتہاد اور تعاقب کیا ہے اس کا ابن جوزی نے بایں طور کے اگر نص کرتے کسی چیز پر یا کئی چیزوں پر تو نہ باطل ہوتا اجتہاد اس واسطے کہ حادثوں کا حصر کرنا ممکن نہیں اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہ خوف کیا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہ لکھیں اس کو بیچ حالت غلبے بیماری کے تا کہ پائیں اس کے ساتھ منافق لوگ راہ طرف طعن کی اس نوشتہ میں اور یہ جو فرمایا کہ میرے پاس جھگڑنا لائق نہیں تو اس میں اشعار ہے کہ اولیٰ یہ تھا کہ حکم بجالانے کی طرف جلدی کرتے اگرچہ وہ چیز کہ اختیار کیا اس کو عمر رضی اللہ عنہ نے صواب ہے اس واسطے کہ حضرت ﷺ نے اس کے بعد اس کا تدارک نہ کیا کما قدمناہ اور قرطبی نے کہا کہ اختلاف ان کا بیچ اسکے مانند اختلاف ان کے ہے بیچ فرمانے حضرت ﷺ کے واسطے ان کے کہ کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں سو بعض نے نماز کے فوت ہونے کا خوف کیا تو انہوں نے عصر کی نماز راہ میں پڑھ لی اور تمسک کیا دوسروں نے ساتھ ظاہر امر کے تو انہوں نے نماز نہ پڑھی تو حضرت ﷺ نے کسی پر سختی نہ کی بہ سبب اجتہاد جائز کے اور مقصد صالح کے اور یہ جو کہا کہ نکلے ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہوئے تو اس کا ظاہر یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کے ساتھ تھے اور یہ کہ وہ نکلے اس حالت میں کہتے ہوئے یہ کلام اور یہ واقع کے برخلاف ہے سوائے اس کے نہیں کہ کہتے تھے اس کو اس وقت جب کہ اس حدیث کو بیان کرتے تھے اور اس حدیث میں دلیل ہے اوپر جواز لکھنے علم کے اور اس پر کہ اختلاف کبھی ہوتا ہے سبب بیچ محروم ہونے کے خیر سے جیسا کہ واقع ہوا ہے بیچ قصے دو مردوں کے جو آپس میں جھگڑے تھے پس اٹھائی گئی تعیین شب قدر کی اس سبب سے اور اس میں واقع ہونا اجتہاد کا ہے روبرو حضرت ﷺ کے اس چیز میں کہ اس میں حضرت ﷺ پر وحی نہ اتری ہو اور باقی بحث اس کی مغازی میں آئے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ (فتح)

ہدیۂ مجیدیہ

ترجمہ

تحفۂ اثنا عشریہ

تالیف: حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ

(المتوفی ۱۲۳۹ھ)

ترجمہ: مولانا محمد عبد المجید خاں رحمہ اللہ

نور محمد۔ اصح المطابع و کارخانہ تجارتِ کتب آرام باغ۔ کراچی

اہل سنت کو بہت تنگ کر کے تشیع ان کے ذمہ ثابت کرتے ہو تو یہ ہے جواب اُس کا موافق اصول شیعہ کے سُننا چاہیے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ابو بکرؓ مسئلہ جدّہ اور کلالہ کا معلوم نہ تھا تو امامت میں اُن کے کچھ نقصان نہیں کرتا۔ کیونکہ بموجب روایاتِ شیعہ حضرت امیرؓ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے۔ حالانکہ باجماع امام مطلق تھے۔

رَوَی عَبْدُ اللّٰہِ ابْنُ بِشْرٍ اَنَّ عَلِیًّا سُئِلَ عَنْ مَسْئَلَۃٍ فَقَالَ لَا عِلْمَ لِیْ بِھَا ثُمَّ قَالَ وَ اَبْرُدُ ھَا عَلٰی کَبِدِیْ سُئِلْتُ عَمَّا لَا اَعْلَمُ وَرَوَاہُ سَعْدَانُ ابْنُ نَصْرٍ اَیْضًا۔

روایت کی عبداللہ بن بشر نے یہ کہ علیؓ سے ایک مسئلہ پُوچھا گیا تو اُنھوں نے کہا مجھ کو خبر نہیں ہے اِس مسئلے کی بابت پھر کہا میں ٹھنڈا کرتا ہوں اپنے کلیجے کو اس سے کہ مجھ سے پوچھا گیا اُس چیز کی بابت جس کو میں نہیں جانتا ہوں روایت کی اس کی سعدان بن نصر نے بھی۔

نیز امام ناطق یعنی جعفر صادقؒ کو بعض مسائل معلوم نہ تھے۔

رَوٰی صَاحِبُ قُرْبِ الْاِسْنَادِ مِنَ الْاِمَامِیَّۃِ عَنْ اِسْمٰعِیْلَ ابْنِ جَابِرٍ اَنَّہٗ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ فِیْ طَعَامِ اَھْلِ الْکِتَابِ فَقَالَ لَا تَاْکُلْہُ ثُمَّ سَکَتَ ھُنَیْھَۃً ثُمَّ قَالَ لَا تَاْکُلْہُ ثُمَّ سَکَتَ ھُنَیْھَۃً ثُمَّ قَالَ لَا تَاْکُلْہُ ثُمَّ سَکَتَ ھُنَیْھَۃً ثُمَّ قَالَ لَا تَاْکُلْہُ وَلَا تَتْرُکْہُ اِلَّا تَنَزُّھًا اِنَّ فِیْ اٰنِیَتِھِمُ الْخَمْرَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ

روایت کی صاحب قرب اسناد نے جو منجملہ امامیہ کے ہے اسمٰعیل بن جابر سے بیشک اُس نے کہا کہ پُوچھا میں نے ابی عبداللہ علیہ السلام سے اہلِ کتاب کے طعام کے بارے میں۔ تو فرمایا کہ مت کھا و اُس کو، پھر سکوت کر کے کہا مت کھا اُس کو، پھر تھوڑا سکوت کیا پھر کہا مت کھا اُس کو، پھر تھوڑا سکوت کیا پھر کہا مت کھا اس کو اور ترک بھی نہ کر۔ برتنوں میں شراب اور خوک کا گوشت ہوتا ہے۔

اُس روایت سے صریح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام علیہ السلام کو حکم کھانے اہلِ کتاب کا معلوم نہ تھا آخر بہت تامل سے بھی حکم صریح معلوم نہ ہوا، ناچار احتیاط پر عمل فرمایا۔

مطاعن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہ گیارہ طعن ہیں۔ اوّل عمدہ طعنوں میں شیعہ کے نزدیک قصہ قرطاس یعنی کاغذ کا ہے۔ بخاری و مسلم

کی روایت کے موافق ابن عباسؓ سے مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پنجشنبہ کے دن چار روز پہلے وفات سے صحابہؓ سے جو حجرۂ مبارک میں حاضر تھے خطاب فرمایا کہ کاغذ اور قلم دوات میرے پاس لاؤ تاکہ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھدوں کہ بعد میرے گمراہ نہ ہو۔ اس بات پر حاضرین نے اختلاف کیا کاغذ قلم لانے میں اور نہ لانے میں۔ اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ قرآن مجید جو ہمارے پاس ہے یہی کافی ہے اس وقت حضرتؐ کو درد کی شدت ہے لہذا کیا ضرور۔ پس بعض نے عمرؓ کے قول کی تائید کی بعض نے کہا ضرور لانا چاہیئے جو حضرتؐ منگاتے ہیں کاغذ قلم وغیرہ۔ اس اثنا میں بہت سا شور وغل ہوا۔ اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہذیان اور اختلاط کلام ہوگیا۔ پھر آپؐ سے پوچھا کہ آپؐ کیا چاہتے ہیں پھر سے فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ اس واسطے کہ پیغمبروں کے پاس جھگڑا کرنا اور شور وغل مچانا لائق نہیں ہے۔ اس قضیہ اور پرخاش کے سبب سے کسی نوشتہ کا لکھنا موقوف رہا پس یہ قصہ قرطاس کا ہے موافق صحیح روایات اہل سنت کے خاطر خواہ شیعہ، اور وہ اس قصہ میں کئی طرح عمرؓ کی طرف بذریعہ طعن متوجہ ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی ہے اور عمرؓ نے آپؐ کے قول کو رد کیا گویا وحی کو رد کیا قولہ تعالےٰ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى (پیغمبر اپنی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا ہے مگر وحی ہے کہ اُس پر نازل کی جاتی ہے) اور رد وحی کا کفر ہے۔ قولہ تعالیٰ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (اور جو کوئی اُس چیز پر حکم نہ کرے جو نازل ہوئی وہ کافروں میں سے ہے)۔

دوسرے یہ کہ کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہذیان اور اختلاط کلام ہوگیا یعنے بہکی بہکی باتیں کرنا، حالانکہ انبیاءؑ ان باتوں سے معصوم ہیں۔ جنون بالاجماع انبیاءؑ پر جائز نہیں ہے ورنہ اُن کے قول وفعل کا اعتماد ہی کیا ہے۔ پس ہر حال میں قول وفعل انبیاءؑ کا قابل ماننے اور پیروی کے ہے۔

تیسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رفع صوت کیا اور تنازع یعنے چلانے اور جھگڑنے لگے باوصف اس کے کہ رفع صوت آپؐ کے سامنے گناہ کبیرہ ہے بدلیل قرآن :۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (اے وہ لوگ کہ ایمان لائے ہو مت بڑھاؤ اپنی آواز کو آواز نبی سے اور چلا کر اُس سے بات مت کہو جیسے چلاتے ہو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا نہ ہو عمل حبط ونابود ہو جائیں اور تم اس کو نہ جانو)۔

. . . چوتھے اُمّت کی حق تلفی کی اس واسطے کہ اگر یہ نوشتہ لکھا جاتا تو گمراہی سے محفوظ رہتے۔ اب ہر مقدمہ میں حیران و پریشان ہیں اور فروع و اصول میں اختلاف پیدا کئے ہیں۔ پس عمرؓ نے جو اس بات کو رد کیا ان سب اختلافوں کا وبال اُن کی گردن پر ہے۔ یہ ہے تقریر طعن کی اور ایسے زور شور سے کہ کسی کتاب میں ایسے طمطراق سے معلوم نہیں ہوتی۔

جواب ان چاروں طعنوں کا مجملاً ذکر ہے کہ یہ کام فقط حضرت عمرؓ نے نہیں کئے ہیں جتنے لوگ حجرے میں حاضر تھے اس مقدمہ میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ اور حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ بھی اُس وقت حاضر تھے۔ پس اگر یہ بھی منع کرنے والوں میں تھے تو شریک عمرؓ کے ہوئے جملہ مطاعن میں اور اگر اُس گروہ میں تھے جو کاغذ وغیرہ کا لانا تجویز کرتے تھے تو بعض مطاعن اُن کی طرف بھی عائد ہوتے ہیں۔ جیسے رفع صوت بحضور پیغمبرؐ خصوصاً اس وقتِ نازک میں اور حق تلفی اُمّت کہ منع کرنے والوں کے منع کرنے سے کاغذ دوات حاضر کرنے سے باز رہے نہ اُس وقت لائے نہ دوسرے وقت۔ چاہیئے تھا کہ بعد اُس کے کہ فرصت دراز تھی لاکر لکھا لیتے۔ پس وجوہ اس طعن کا مشترک ہے عمرؓ کو بھی شامل ہے اور غیر عمرؓ کو بھی کہ بعض اُن سے ایسے ہیں کہ باتفاق شیعہ اور سُنّی کے مطعون نہیں ہو سکتے۔ اور جب طعن مطعون اور غیر مطعون دونوں میں مشترک ہوا تو وہ طعن ہی ساقط ہوا۔ طعن ہی نہ رہا نہ محتاج جواب کا بلکہ اگر تامل کیا جائے تو پہلی وجہ جو طعن کی ہے وہ بھی مشترک ہے کیونکہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بلفظ اِیْتُوْنِیْ بِقِرْطَاسٍ (لاؤ تم میرے پاس کاغذ) خطاب سب حاضرین کی طرف تھا نہ کہ خاص عمرؓ کی طرف۔ پس اگر یہ امر واجب یا فرض ہو تو ہر ایک گنہگار اور مخالف فرمان شرع کا ہوا۔ حد یہ کہ عمرؓ اوروں کے لئے باعث اس نافرمانی کے ہوئے۔ اوروں نے حکم عمرؓ کا مانا اور مخالفت حکم رسولؐ کی کی اور مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ میں بیشک داخل ہوئے۔ پس حاشا نسبت عمرؓ کی ایسی ہوئی جیسے شیطان کی کہ کافروں کے واسطے باعث کفر کا ہے اور حاشا نسبت اوروں کی مثل کافروں کے۔ اور خوب روشن ہے کہ طعن کے واسطے فقط شیطان ہی کی طرف توجہ نہیں کر سکتے ورنہ کافر معذور ہو جائیں بلکہ جبر یائیں اور یہ خلاف قرآن بلکہ جملہ شریعتوں کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ امر واجب فرض نہ ہو اصلاح و ارشاد کی غرض سے ہو تو عمرؓ اور غیر عمرؓ سب اس کے ترک اور سُستی میں مطعون نہیں ہیں اور کسی طرح ملامت اُن پر عائد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ جو امر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ اصلاح و ارشاد کے واسطے ہو مخالفت اُس کی باجماع جائز ہے۔ چنانچہ آگے آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ اور اگر جواب تفصیلی ان مطاعن کا سُننا مرغوب ہو تو تفصیل سُننا چاہیئے۔

وجہ اوّل طعن کی مبنی اس بات پر ہے کہ عمرؓ نے وحی کو رد کیا اور جملہ قول پیغمبرؐ کے وحی ہیں لقولہ تعالیٰ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ اِن دونوں مقدموں میں کھلا ہوا خلل ہے۔ اوّل میں کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو رد نہیں کیا بلکہ آرام و راحت اور ترفیہ اور رنج نہ اٹھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شدت بیماری میں منظور رکھا اس معاملہ کو انکار و رد حکم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا سمجھنا نہایت بڑی تعصب اور بغض ہے۔ ہر کوئی اپنے بیمار عزیز کو محنت اٹھانے اور رنج کھینچنے سے بچاتا ہے۔ اگر کسی وقت وہ بیمار حالت شدت درد و مرض میں حاضرین کی مصلحت و فائدہ کے واسطے خود ہی کچھ مشقت اٹھانا چاہتا ہے تو اس کو کسی سبب درد وغیرہ کے مانع ہوتا ہے۔ اور اپنی بے پروائی جتاتا ہے کہ اس کی کچھ حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ معاملہ بزرگوں میں زیادہ تر مروج و معمول ہے لہذا جب عمرؓ نے دیکھا کہ حضرتؐ واسطے فائدہ اصحابؓ و امتؐ کے چاہتے ہیں اس وقت تنگ میں کہ شدت مرض کی از حد ہے خود املا نوشتہ کا فرمائیں یا خود لکھیں کہ یہ بات اور حرکت قولی یا فعلی یعنے کسی کو مضمون بتانا یا آپ لکھنا موجب کمال رنج و مشقت کا ہوگا۔ تجویز اس بات کی گوارا نہ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بسبب کمال ادب کے خطاب نہ کیا بلکہ اور لوگوں کو آیہ کریمہ سے ثابت کیا کہ اس تحریر دینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے اس سے استغنا حاصل ہے تاکہ آپ کے کان تک پہنچے اور آپ جانیں کہ اس وقت میں ایسی مشقت اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اور فی الواقع اس مقدمہ میں عقلمندوں کے نزدیک صد آفرین اور ہزار تحسین باریک بینی فکر عمرؓ پر ہے کہ قبل اس واقعہ سے تین مہینے پہلے آیہ کریمہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (آج میں نے دین تمھارا تمھارے واسطے کامل کیا اور نعمت اپنی تم پر تمام کی اور پسند کیا تمھارے واسطے طریق اسلام کو دین) نازل ہو چکی تھی اور دروازے نسخ و تبدیل اور کمی بیشی دین کے مطلقاً بند کر کے اور مہر اس پر لگا کر چھوڑ دیا تھا۔ اسی آیت پر عمرؓ نے اشارہ کیا اس عبارت میں کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ (ہم کو اللہ کی کتاب کافی ہے) مطلب یہ کہ اگر یہ خیال کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں کوئی نئی بات جو پہلے سے کتاب شریعت میں نہیں آئی ہے لکھائیں گے کہ موجب تکذیب اس آیت کی ہو یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محال ہے پس مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت سوائے اس کے نہیں ہے کہ تاکید ان احکام کی فرمائیں جو پہلے ٹھہر چکے ہیں اور ہم کو خدا تعالیٰ کی تاکید سے زیادہ آپ کی تاکید مقابل وحی منزل یعنے قرآن کی نہ ہوگی پھر مشقت اٹھانا آپ کا اس وقت میں کیا ضرور ایسی بات کے واسطے جو چنداں درکار نہیں ہے بہتر یہ ہے کہ راحت و آرام

یں رہیں۔ اور یہ لفظ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَہُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا کِتَابُ اللّٰہِ حَسْبُنَا (بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے وہی ہم کو کافی ہے) صریح اس قصد پر گواہ ہے پس معلوم ہوا کہ عمرؓ کی نسبت یہ بات کہنا کہ حکم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا رد کیا کمال غلط فہمی اور نادانی اور نہایت ہی عداوت و تعصب کی بات ہے۔ اور ایسی مصلحتیں اور مشورے ہمیشہ معمولی بات تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ اور صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے تھے خصوصاً حضرت عمرؓ کو اس مقدمہ میں خصوصیت وجرأت سب سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی کہ منافق پر نماز پڑھنے اور پردہ نشین کرنا ازواج مطہراتؓ کا۔ اور جنگ بدر کے قیدیوں کا قتل کرنا۔ اور مقام ابراہیم کو مصلّے پکڑنا۔ اور مثل ان کے ان سب معاملات میں موافق عرض عمرؓ کے وحی آئی تھی اور رائے صواب ان کی اکثر مقدمات میں مقبول پیغمبرؐ ہوتی تھی بلکہ خدا تعالیٰ کو بھی۔ اور اگر ایسی عرض مصلحت کو ردّ وحی اور ردّ قول پیغمبرؐ کہا جائے تو حضرت امیرؓ بھی چند موقعوں میں شریک حضرت عمرؓ کے ہو جائیں گے۔ اول یہ کہ بخاری میں جو بڑی صحیح کتاب اہل سنت کی ہے بطریق متعدد مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت امیرؓ و زہراؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان کو خوابگاہ سے اٹھایا اور نماز تہجد ادا کرنے کی بہت تاکید فرمائی اور کہا قُوْمَا فَصَلِّیَا (اٹھو دونوں اور نماز پڑھو) حضرت امیرؓ نے کہا وَاللّٰہِ لَا نُصَلِّیْ اِلَّا مَا کُتِبَ اللّٰہُ لَنَا (قسم ہے خدا کی ہم مقرری (فرض) نماز سے زیادہ نہیں پڑھیں گے) وَاِنَّمَا اَنْفُسُنَا بِیَدِ اللّٰہِ (اور بیشک ہمارے دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں) اگر نماز تہجد کی توفیق ہم کو دیتا تو ہم پڑھتے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کے گھر سے لوٹ گئے اور ران میں پیٹ کر کہتے تھے وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (انسان اکثر بات میں ہر چیز سے زیادہ بات بنانے والا ہے)۔

پس اس قصہ میں دو امر حضرت امیرؓ سے وقوع میں آئے۔ ایک تو جدل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقدمہ شرع میں۔ دوسرے تمسک بشبہ خرقہ جبر یہ کہ ہرگز شرع میں مسموع نہیں لیکن چونکہ قرینہ حالیہ گواہی صدق وراستی اور ان کے قصد نیک پر دیتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ملامت نہ فرمائی۔ دوسرے یہ بھی صحیح بخاری میں موجود ہے کہ جب حدیبیہ کی لڑائی میں صلحنامہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان لکھا جاتا تھا حضرت امیرؓ نے لفظ "رسول اللہؐ" کا آپؐ کے القاب میں لکھا۔ کفار کے رئیسوں کی طرف سے اس لفظ کے لکھنے کا انکار ہوا کہ ہم اس لفظ کو مانتے تو لڑتے کیوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چند حضرت امیرؓ سے فرمایا کہ اس لفظ کو مٹا دو حضرت امیرؓ نے

کہ حد درجہ ایمان آپ کے ساتھ رکھتے تھے نہیں مٹایا۔ اور مخالفت امر رسولؐ کی کی یہانتک کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے ہاتھ سے مٹایا۔ مگر اہل سُنت ایسے امور کو نہ مخالفت پیغمبرؐ کی لکھتے ہیں اور نہ جانتے ہیں۔ نہ حضرت امیرؓ پر طعن کرتے ہیں تو عمرؓ پر کیسے طعن کریں گے شیعہ اگر ایسی باتوں کو بھی ردِّ قول پیغمبرؐ کا کہیں گے تو اپنے پاؤں پر آپ بسولہ ماریں گے اور دائرہ گفتگو کا اپنے اوپر تنگ کریں گے کیونکہ ان کی کتابوں میں بھی اس قسم کی مخالفتیں حضرت امیرؓ کے حق میں جو بغرض مصلحت اور مشورے کے وقت حضرت امیرؓ سے ہوئے ہیں مروی ہیں۔

رَوَى الشَّرِيفُ الْمُرْتَضٰى الْمُلَقَّبُ بِعَلَمِ الْهُدٰى عِنْدَ الْاِمَامِيَّةِ فِيْ كِتَابِ الْغُرَرِ وَالدُّرَرِ عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ عَنْ اَبِيْهِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّهٗ قَالَ قَدْ اَكْثَرَ النَّاسُ عَلٰى مَارِيَةَ الْقِبْطِيَّةِ اُمِّ اِبْرَاهِيْمَ ابْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ابْنِ عَمٍّ لَهَا قِبْطِيٍّ كَانَ يَزُوْرُهَا وَيَخْتَلِفُ اِلَيْهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ هٰذَا السَّيْفَ وَانْطَلِقْ فَاِنْ وَجَدْتَهٗ عِنْدَهَا فَاقْتُلْهُ فَلَمَّا اَقْبَلْتُ نَحْوَهٗ عَلِمَ اَنِّيْ اُرِيْدُهٗ فَاَتٰى نَخْلَةً فَرَقِيَ اِلَيْهَا ثُمَّ رَمٰى بِنَفْسِهٖ عَلٰى قَفَاهُ وَشَغَرَ بِرِجْلَيْهِ فَاِذَا بِهٖ اَجَبُّ وَاَمْسَحُ لَيْسَ لَهٗ مَا لِلرِّجَالِ لَا قَلِيْلٌ وَّلَا كَثِيْرٌ قَالَ فَغَمَدْتُ السَّيْفَ وَرَجَعْتُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ يَصْرِفُ عَنَّا الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ۔

روایت کی شریف مرتضےٰ نے جس کا لقب امامیہ کے نزدیک علم الہدیٰ ہے کتاب درر و غرر میں محمد بن حنفیہ اور انھوں نے اپنے باپ امیر المومنین علی علیہ السلام سے فرمایا بیشک جب ماریہ قبطیہ کی تہمت میں لوگوں نے بہت سی باتیں کیں جو کہ ان ابراہیم حضرتؐ کے بیٹے کی ہیں ان کے چچازاد بھائی کے ساتھ کہ قبطی تھا ان سے ملتا تھا اور ان کے پاس آجاتا تھا پس فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلوار لے اور جا اگر اس مرد کو ماریہ کے پاس پائے تو مار ڈال پس میں متوجہ ہوا اس کی طرف اس نے جانا کہ میں اس کا قصد رکھتا ہوں، سو آیا میرے پاس اور درخت خرما پر چڑھ اور پیٹھ کے بل اپنے آپ کو گرا دیا اور اپنے دونوں پاؤں اٹھائے تو ناگاہ میں نے اس کو دیکھا مجبوب صاف کہ اس کے پاس مثل مردوں کے کچھ نہ تھا نہ کم نہ زیادہ یعنی خوجہ (خصّی) تھا۔ میں نے تلوار میان میں کر لی اور حضرتؐ کے پاس لوٹ آیا اور ان کو اس کے حال سے خبر دی آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ہمارے اہل بیت کو پلیدی سے بچاتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ماریہ قبطیہ بھی اہل بیت سے تھیں اور آیہ تطہیر میں داخل تھیں۔

شکر ہے خدا کا اُس کی وسعتِ رحمت اور عمومِ نعمت پر۔

رَوَی مُحَمَّدُ ابْنُ بَابُوَیْهِ فِی الْاَمَالِیْ وَالدَّیْلَمِیُّ فِیْ اِرْشَادِ الْقُلُوْبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰی فَاطِمَةَ سَبْعَةَ دَرَاهِمَ وَقَالَ اَعْطِیْهَا عَلِیًّا وَمُرِیْهِ اَنْ یَّشْتَرِیَ لِاَهْلِ بَیْتِهٖ طَعَامًا فَقَدْ غَلَبَهُمُ الْجُوْعُ فَاَعْطَتْهَا عَلِیًّا وَقَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَكَ اَنْ تَبْتَاعَ لَنَا طَعَامًا فَاَخَذَهَا عَلِیٌّ وَخَرَجَ مِنْ بَیْتِهٖ لِیَبْتَاعَ طَعَامًا لِاَهْلِ بَیْتِهٖ فَسَمِعَ رَجُلًا یَّقُوْلُ مَنْ یُّقْرِضُ الْمَلِیَّ الْوَفِیَّ فَاَعْطَاهُ الدَّرَاهِمَ۔

روایت کی محمد بن بابویہ نے امالی میں اور دیلمی نے ارشاد القلوب میں بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو سات درم دیئے اور فرمایا کہ یہ درم علیؓ کو دے اور کہہ کہ خریدے اپنی اہل بیت کے واسطے کھانا اس واسطے کہ ان پر بھوک غالب ہو رہی ہے سو دیئے فاطمہؓ نے وہ درم علیؓ کو اور کہا بیشک تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ خرید لاؤ ہمارے واسطے کھانا پس علیؓ نے وہ درم لئے اور گھر سے نکلے تاکہ کھانا خریدیں اپنے اہل بیت کے واسطے اس اثنا میں سُنا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ کون ہے ایسا جو ہم کو قرض دے سچے وعدہ پر۔ پس علیؓ نے وہ درہم اُس کو دے دیئے۔

اب اِس قصہ میں مخالفت حکم رسول اللہؐ کی بھی ہے اور تصرّف بھی غیر کے مال میں بغیر اجازت اس کے نیز تلف کرنا حق عیال کا اور قطع رحم اقرب کا جو لڑکے اور بیوی ہیں۔ اور رنج دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اولاد اور فرزندوں کو بھوکا دیکھنے سے ہوگا۔ لیکن یہ سب لِلّٰهِ فِیْ اللّٰهِ وَاِیْثَارًا لِطَاعَةِ اللّٰهِ (واسطے خدا کے اور راہِ خدا میں برگزیدہ طاعت خدا سے) تھا مقبول اور محل تعریف و توصیف ہوا نہ کہ موقع عتاب و شکایت کا۔ اور قرینوں سے حضرت امیرؓ کو خوب معلوم تھا کہ حضرت زہراؓ اور حسنینؓ اِس پر راضی ہوں گے اور آنحضرتؐ بھی جائز فرمائیں گے۔

اب دوسرا مقدمہ یعنی تمام قول پیغمبرؐ کے وحی ہیں دلیل عقلی و نقلی دونوں راہ سے باطل ہے۔ رہی عقلی دلیل سو ہر عاقل کے نزدیک ظاہر ہے کہ معنی رسول کے پیغام پہنچانے والے کے ہیں اور جب نسبت اس کی خدائے کریم کی طرف کی تو معنے ہوئے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا۔ پس رسالت میں اتنا ہی داخل ہے کہ اُس کی طرف وحی آئی ہو اور اُس کے واسطہ سے وہ پیغام خدا کی طرف سے ہم کو پہنچے نہ یہ کہ ہر قول اُس کا پیغام خدا کا ہو اور یہ آیت مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی صریح خاص قرآن کے ساتھ ہے بدلیل عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (سکھایا اُس کو سخت قوت والے نے) نہ کہ عام جملہ باتوں میں پیغمبرؐ کی۔ اور خوب روشن ہے کہ اگر کسی کو کوئی بادشاہ یا امیر اپنا رسول کرکے کسی

ملک کی طرف بھیجے ہرگز اس ملک کے لوگ جملہ باتوں کو اُس رسول کی اُس بادشاہ کا حکم نہ جانیں گے۔

رہی دلیل نقلی سو اس سبب سے کہ اگر جملہ باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وَحْیٌ مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰہِ (وحی نازل کی ہوئی اللہ تعالیٰ سے) ہوتیں تو قرآن مجید میں آپ کی بعض باتوں پر عتاب کیوں ہوتا۔ حالانکہ بہت جگہ عتاب شدید نازل ہوا جیسے عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ (معاف کرے اللہ تجھ کو کیوں اجازت دی تو نے اُن کو) وقولہ تعالیٰ وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (مت ہو خیانت کاروں کی طرف سے خصومت کنندہ اور بخشش چاہ خدا تعالیٰ سے بیشک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے) وقولہ تعالیٰ: وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ الخ (اور لڑائی مت کر اُن لوگوں کی طرف سے کہ خیانت کرتے ہیں آپس میں آخر آیت تک) خیال کرو کہ آپ نے جو بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کا اذن دیا اس پر ایسا تشدد کیوں واقع ہوتا لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (اگر اگلا نوشتہ خدا کا تمہارے پاس نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اُس میں تم کو سزا بڑی دی جاتی)۔

اور اگر ایسا ہی ہوتا تو قبطی کے قتل کا حکم اور خریدنے طعام اور مٹانے لفظ "رسول اللہ" اور حکم تہیہ کا سب ہی وَحْیٌ مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰہِ ہوتا۔ اور رد اس وحی کا جناب امیرؓ پر لازم آتا۔ نیز اس صورت میں امر صحابہؓ سے مشورہ کرنے کا کہ آیت وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (مشورہ کر کاموں میں ان کے ساتھ) اس کے کیا معنے تھے اور اطاعت بعض امور میں بعض صحابہ کی جو کہ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ (اگر فرمانبرداری کرے تمہاری بہت کاموں میں تو ضرور گرفتار ہو جاؤ گے) مستفاد ہوتی ہے کس چیز پر قیاس کی جائیگی۔ نیز جناب امیرؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نہ ہونے کے سبب کہ تبوک کی لڑائی کو جاتے تھے مدینہ میں اہل وعیال کے پاس رہنے کا حکم دیا تو کیسے کہتے تھے اَتُخَلِّفُنِیْ فِی النِّسَآءِ وَالصِّبْیَانِ (آیا چھوڑے جاتے ہو مجھ کو عورتوں اور بچوں میں) وحی کے مقابلہ میں ان اعتراضوں کا کرنا کب جائز تھا۔ اور اصول امامیہ میں بھی دیکھنا چاہیے کہ سب باتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نہیں جانتے ہیں اور جملہ افعال کو ایسا نہیں جانتے کہ سب کی پیروی واجب ہو۔ پس اس طعن میں یہ مقدمے فاسد باطل ہیں کہ نہ مطابق واقع کے ہے نہ اپنے مذہب نہ مخالف کے مذہب کے موافق اپنے طعن کو پکا کرنے اور رواج دینے کو لانا کیسا حق تعصب عناد کا ادا کرنا ہے۔

اب ہم بلند سرائی کرتے ہیں۔ اور اقوال پیغمبر سے بالاتر ہو کر معاملہ طے کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شیعہ سنی دونوں کے نزدیک عرض مصلحت کا کرنا اور مشقت کو ٹالنا اور برخلاف حکم الٰہی کے جو بے واسطہ

کہ بالقطع وحی منزل من اللہ ہے چند بار اصرار کرنا رد وحی نہیں ہے۔ جناب پیغمبر خاتم المرسلین نے شب معراج بمشورہ دوسرے پیغمبر کے کہ عمدہ اولوالعزم سے ہیں یعنے حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ السلام نو دفعہ لوٹ لوٹ کر گئے اور عرض کی کہ اس کو میری اُمت نہ اٹھا سکے گی۔ اور اس کو بابویہ نے کتاب المعراج میں ذکر کیا ہے معاذ اللہ اگر یہ امر رد وحی کا ہو تو پیغمبروں سے کیسے صادر ہو۔ اور اس کو رد وحی کہنا سوائے ملحدی اور زندیقی کے اور کیا کہا جائے۔ نیز لوٹنا حضرت موسیٰ کا اپنے پروردگار کے حکم کو بعد اس کے کہ بلاواسطہ اُن کو حکم ہوا تھا قرآن مجید میں صریح منصوص ہے۔

قولہ تعالیٰ وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰۤی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا یَتَّقُوْنَ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ قَالَ کَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ۔

اور جب ندا کی تیرے پروردگار نے موسیٰ کو کہ جاؤ قوم ظالم پر جو قوم فرعون ہیں کہ وہ نہیں ڈرتے، موسیٰ نے کہا اے پروردگار میرے! میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلا جائیں گے اور میرا سینہ گھٹے گا اور میری زبان نہیں چلے گی پس ہارون کو رسول کر اور ان لوگوں کا ایک گناہ کی میرے ذمے ہے پس بھی ڈرتا ہوں کہ مبادا مجھے مار ڈالیں فرمایا ہاں ہرگز نہیں ہے جاؤ تم دونوں معجزات کے ساتھ ہماری ہم تمہارے ساتھ ہیں اور سنتے ہیں۔

نیز شیعوں کے اپنے اصول میں یہ بات منجملہ طے شدہ باتوں کے ہے کہ امر رسول کا بلکہ امر خدا کا بلاواسطہ ہو محتمل ندب کا ہے اور مقتضی وجوب کا نہیں یقیناً۔ پس لوٹنا چاہیے تاکہ واضح ہو جائے کہ مراد اس امر سے وجوب ہے یا ندب الشیخ ابن المطہر الحلی نے اس کو کتاب النہایۃ والمبادی میں ذکر کیا ہے۔ جب ایسا حال ہے تو عمرؓ کا اس لوٹنے میں کیا گناہ اور کیا تقصیر۔ جس کے ساتھ مقدمہ استغنا میں آیت قرآنی کی دستاویز موجود اور تحمل مشقت کے واسطے کہ صریح دلالت مندوبیت اس امر پر کرتی ہے لگی ہوئی ہے۔

اور وجہ ثانی جو طعن میں ہے یعنی عمرؓ نے بہکی باتوں کی نسبت پیغمبرؐ کی طرف کی یہ بھی بیجا ہے۔ اس واسطے کہ اول تو یہ کہاں سے بیقین ثابت ہو گیا کہ یہ لفظ اَھَجَرَ اِسْتَفْھِمُوْہُ (آیا پریشان گوئی ہی پھر ان سے پوچھو) عمرؓ ہی نے کہی۔ اکثر روایتوں میں قَالُوْا واقع ہے۔ احتمال ہے کہ شاید جو لوگ کاغذ دوات لانا تجویز کرتے ہوں انھوں نے اس قول سے تقویت اپنی بات کی کی ہو یا استفہام انکاری ہو جیسے ہجر اور ہذیان جس کے معنے پریشان اور بیہودہ بکنے کے ہیں یہ تو تسلیم شدہ ہے کہ زبان پیغمبر سے نہیں نکلتی۔ پس جو کچھ فرماتے ہیں اس کا اہتمام کرو اور جس کے لکھنے کا ارشاد ہوتا ہے اس کو پوچھو کہ کیا منظور ہے۔ اور احتمال ہوتا ہے کہ جو مانع تھے انھوں نے بھی استفہام انکاری کے طور پر کہا ہو کہ آخر پیغمبروں کو

ہذیان تو ہوتا نہیں ظاہر یہ کلمہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا پھر پوچھو کہ حقیقت میں کسی نوشتے کا لکھنا نظر ہے یا اور کوئی چیز۔ اور وجہ نہ سمجھنے اس کلمے کی صریح وظاہر تھی اس لئے کہ عادت شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی تھی کہ احکام کو خدا سے نسبت فرماتے تھے۔ اور اس موقع پر یہ نہیں فرمایا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیۡ اَنۡ اَکۡتُبَ لَکُمۡ کِتَابًا لَنۡ تَضِلُّوۡا بَعۡدِیۡ (بیشک اللہ نے حکم کیا ہے مجھ کو کہ میں ایک نوشتہ لکھ دوں کہ بعد میرے بہکو نہیں) منع کرنے والوں کو توہم پیدا ہوا کہ آپ نے ضرور خلاف عادت نہیں فرمایا ہوگا گر ہم نہیں سمجھے کہ استفسار کرنا چاہیے اور قطعاً جانتے تھے کہ آپ لکھتے نہ تھے نہ مشق اس امر کی رکھتے تھے نہ کبھی لکھا دفعاً للتُّهمة (دفع تہمت کے واسطے) موافق نص قرآن وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (اور تو ایسا نہ تھا کہ پڑھ لیتا کبھی نوشتے کو نزول قرآن سے پہلے اور نہ لکھتا اس کو اپنے سیدھے ہاتھ سے) اور اس عبارت میں اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی یہ کیا بات ہے سمجھنا چاہیے۔ اس واسطے کہ کلام آپ کا ہذیان ہو نہیں سکتا۔ اور یہ بھی عادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ سوائے قرآن کے اور کچھ لکھاتے نہیں تھے بلکہ ایک بار عمر بن خطاب ایک نسخہ توریت کا لائے اور پڑھتے تھے آپ نے منع کیا۔ اور اس وقت خلاف عادت مقررہ کے سوائے قرآن کے اپنے ہاتھ سے لکھنے کو فرمایا حاضرین کو کمال تعجب ہوا اور کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اسی سبب سے ذکر ہذیان کا بطریق استفہام انکاری یا تعجبی ان میں سے بعض کی زبان پر گزرا۔ اگر غرض ان کی ہذیان ثابت کرنے کی پیغمبر پر ہوتی تو یہ نہ کہتے۔ پھر پوچھو بلکہ یہ کہتے کہ جانے دو ہذیان کی بات کا کیا اعتبار۔

اور تفصیل کلام کی اس مقام میں یہ ہے کہ ہجر لغت میں اختلاط کلام کے معنے میں ہے ایسے طور پر کہ سمجھا نہ جائے۔ اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قسم میں کہ وہ انبیاء کو بھی ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو جھگڑا نہیں ہے وہ یہ ہے کہ آواز بیٹھ جائے یا غلبہ خشکی کا زبان پر ہو یا آلات گویائی کے ضعیف ہو جائیں کہ مخارج حرفوں کے کماینبغی ظاہر نہ ہوں اور لفظ اچھی طرح سننے میں نہ آئیں کہ ان حالتوں کے لاحق ہونے سے انبیاء کو کچھ نقصان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عارضوں اور توابع مرض سے ہیں۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی باجماع سیر مرض موت میں بحۃ الصوت عارض ہوا تھا یعنے آواز بیٹھ گئی تھی۔ چنانچہ صحیح کتابوں میں حدیث کی موجود ہے۔

دوسری قسم اختلاط کی یہ ہے کہ بسبب غشی اور بخارات دماغ کو چڑھ جانے سے جیسا کہ شدت تپ میں ہوتا ہے کہ اکثر کلام نادرست غیر منتظم خلاف مقصود زبان پر جاری ہوتا ہے اور یہ امر اگرچہ امور بدن سے پیدا ہوتے ہیں لیکن اثر ان کا روح اور دل کو پہنچتا ہے علماء کو اس امر کی تجویز میں انبیاء پر اختلاف ہے

بعض قسم جنون سے قیاس کرکے ممتنع جانتے ہیں۔ بعضے غیر پر قیاس کرکے جائز رکھتے ہیں۔ اور جس سبب سے یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے وہ سبب انبیاء کو بھی لاحق ہوتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ لاحق ہونا غشی کا حضرت موسیٰ علے نبینا و علیہ الصلوٰۃ پر قرآن مجید میں منصوص ہے۔ قولہ تعالیٰ وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا (اور گر موسے بیہوش) اور بیہوش ہوجانا سب پیغمبروں کا وقت نفخ صور کے سوائے حضرت موسے کے یہ بھی صحیح اور ثابت ہے۔ قولہ تعالیٰ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (اور جب دم پھونکا جائے گا صور میں تو بیہوش ہوجائیں گے جو آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں مگر جس کو اللہ چاہے گا) حدیث صحیح میں آیا ہے فَاَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ يُفِيْقُ فَاِذَا مُوْسٰى اٰخِذٌ بِقَائِمَةٍ مِّنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ فَلَا اَدْرِيْ اَصَعِقَ فَاَفَاقَ قَبْلِيْ اَمْ جُوْزِيَ بِصَعْقَةِ الطُّوْرِ (تیس پہلے جس کو ہوش ہوگا وہ میں ہوں گا اور ناگاہ دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کے پایوں سے ایک پایہ پکڑے ہیں میں نہیں جانتا ہوں آیا بیہوش ہوکر افاقہ پایا مجھ سے پہلے یا بیہوشی طور سے مبادلہ ہوگیا) البتہ اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو بسبب ان کی کرامت اور بزرگی کے حالت غشی و بیہوشی میں بھی جو کچھ اُس کے خلاف مرضی ہو بچائے رکھتا ہے قولاً اور فعلاً جو مرضی حق کی ہوتی ہے وہی ان سے صادر ہوتا ہے ہر حالت میں۔ اور خوب ظاہر ہے کہ اس حالت کو جنوں پر نہیں قیاس کرسکتے کہ جنون میں اول خلل روح کے قوائے مدرکہ میں پڑتا ہے اور ہمیشہ مضبوط رہتا ہے بخلاف اس حالت کے کہ روح میں ہرگز اختلال نہیں ہوتا بلکہ آلات بدن کے بسبب غلبہ مخالف کے جو مرض ہے جب روح توجہ اُس کی دفع کی کرتی ہے تو اُس کے حکم میں نہیں رہتی۔ اس واسطے یہ حالت ہمیشہ اور بھی نہیں ہوتی پس یہ حالت مثل نیند کے ہے کہ انبیاء کو بھی لاحق ہوتی ہے کہ اس میں اور حالت بیداری میں بڑا فرق ہے۔ حد یہ ہے کہ نیند میں نزول احکام سے یہ بزرگوار آگاہ و خبردار ہوتے ہیں اس کے ساتھ بھی احکام نیند کے اُن کاموں میں جو ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان سے متعلق ہیں اثر کرتے ہیں۔ اور نماز کا جاتا رہنا اور بے خبری اُس کے وقت نکل جانے سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ کافی کلینی میں لیلۃ التعریس کی خبر میں مذکور ہے۔ اسی طرح سہو و نسیان بھی نماز میں ان کو لاحق ہوتا ہے جیسا کہ امامیہ نے اپنی صحیح کتابوں میں انبیاء و ائمہ سے وقوع سہو کو روایت کیا ہے۔

جو کچھ اس قصہ میں بہت وجہوں کے ساتھ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خلاف عادت ظہور میں آیا جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ اگر بعض حاضرین کو وہم پیدا ہوا ہو کہ مبادا قسم اختلاط کلام سے ہے جو ایسے مرضوں میں ظاہر ہوتا ہے تو بعید نہیں ہے نہ موقع طعن و تشنیع کا ہے۔ قصہ مختصر اُس وقت جب کہ شدت درد

اور التہاب حمی یعنی تپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت ہی زور کیا تھا۔ اور ایک روایت سے صریح یہ بات اور معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس کو بعید جانتے تھے اور کہتے تھے مَا شَأْنُهٗ أَهَجَرَ اِسْتَفْهِمُوْهُ (کیا حال ہے ان کا آیا بہکتے ہیں پوچھو تو ان سے) اس پر بھی اس کہنے والے نے برعایت ادب قطعی بات نہ کی بلکہ بطریق تردد کہا آیا اختلاط کلام ہے یا ہم نہیں سمجھتے۔ ذرا پوچھو تو واضح فرمائیں اور بیداری وہوشیاری کے ساتھ ارشاد کریں تو کاغذ دوات لائیں نہیں تو جانے دیں۔ اس واسطے کہ آپ کو چنداں حاجت مشقت اٹھانے کی نہیں ہے۔ یہ سب باتیں اس صورت پر ہیں کہ اختلاط کلام سے قسم اخیر مراد ہو اور اگر قسم اول مراد ہو یعنے اس مضمون کو خلاف عادت پیغمبر کے ہم دیکھتے ہیں ایسا نہ ہو آپ کے ناطقے میں ضعف ہو گیا ہو اس سبب ہم آپ کے الفاظ کو بخوبی نہیں معلوم کر سکتے ہیں لفظ اور ہیں یا ہم کچھ اور سنتے ہیں دوبارہ پوچھو تاکہ ظاہر فرمائیں اور ہم یقین کے ساتھ جان لیں کہ یہی لفظ ہیں اس وقت دوات و کاغذ لائیں اس میں کوئی مشکل نہیں پڑتی۔

تیسری وجہ طعن کی جو ہے وہ بھی سراسر غلط فہمی ہے اور حق سے چشم پوشی۔ اس واسطے کہ بلند کرنا آواز کا یعنی چلانا آواز پیغمبر پر منع ہے اور اس قصے میں یہ بات کسی سے ظہور میں نہ آئی نہ عمر سے نہ غیر عمر سے اور رفع صوت باہم خود آپ کے سامنے بحثوں اور جھگڑوں میں ہمیشہ جاری وساری تھا ہرگز اس کو آپ نے منع نہ فرمایا۔ بلکہ اشارہ قرآن کا ان بحثوں کو جائز اور تجویز فرماتا ہے دو طرح سے اول یہ کہ اس لفظ کے ساتھ فرمایا ہے لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ اور یوں نہیں فرمایا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ بَيْنَكُمْ عِنْدَ النَّبِيِّ (مت چلاؤ آپس میں جس وقت کہ نبی کے پاس ہو) دوسرے فرمایا كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ (جیسے ایک دوسرے پر چلاتے ہو) پس صریح معلوم ہوا کہ جہر بعض کا بعض پر جائز ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ پہلے عمر نے رفع صوت کیا اور جھگڑے کے باعث ہوئے اول اس کو کسی دلیل سے ثابت کرنا چاہیے پھر زبان طعن کی کھولیں۔ جس حجرہ میں تو ایک جماعت کثیر تھی اور بہت سے آدمیوں کی باتوں میں رفع صوت ضروری ہے۔ اور حضرت کا ارشاد لَا يَنْبَغِيْ عِنْدِيْ التَّنَازُعُ (نہیں لائق ہے میرے پاس آپس میں جھگڑنا) یہ بھی اسی مدعا پر گواہ ہے۔ اس واسطے کہ لَا يَنْبَغِيْ ایسے موقع پر لایا جاتا ہے کہ جہاں اولیٰ بات ترک ہوتی ہو نہ کہ حرام وغیرہ۔ جیسے کوئی کہے کہ زنا کرنا مناسب نہیں ہے سب اہل شرع اس پر ہنسیں گے اور ٹھٹھے ماریں گے۔

اور لفظ قُوْمُوْا عَنِّيْ یہ قسم تنگ مزاجی مریض سے ہے کہ ذرا سی گفت وشنید میں بہت ہی ناخوش ہو جاتا ہے اور جو بات حالت مرض میں تنگ مزاجی کی راہ سے وقوع میں آتی ہے کسی کے حق میں محل طعن

نہیں ہوتی۔ خصوصاً یہ خطاب تو سب حاضرین کی طرف ہے اس میں چاہیے تجویز کرنے والے ہوں چاہے منع کرنے والے اور روایت صحیحہ میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی مرض میں لدود کھلایا تھا۔ اور یہ ایک دوا ہے منہ میں ڈالے رکھنے کی۔ بعد افاقہ کے فرمایا لَا يَبْقَىٰ فِي الْبَيْتِ اِلَّا لُدَّ اِلَّا الْعَبَّاسَ فَاِنَّهُ لَمْ يَشْهَدْكُمْ (گھر میں کوئی نہ رہے مگر یہ کہ اس کو لدود دیا جائے سوائے عباسؓ کے کہ بیشک وہ تمہارے بیچ میں حاضر نہ تھے) اور یہ تنگ مزاجی کہ مرض میں لاحق ہوتی ہے اصلاً نقصان نہیں کرتی کہ جس سبب انبیاء کو اس سے معصوم اعتقاد کیا جائے۔

چوتھی وجہ جو طعن کی ہے اُس کی بنیاد بھی خیال باطل ہی پر ہے۔ اس لئے کہ حق تلفی اُمت کی جب ہوتی کہ کوئی نئی چیز خدا کی طرف سے آئی ہوتی اور اُمت کے حق میں نافع ہوتی اُس کو منع کرتے بمضمون اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کی قطعاً معلوم ہے کہ کوئی حکم نیا نہیں تھا بلکہ کوئی امر دینی بھی نہ تھا صرف نیک مشورہ اور ملکی مصلحتوں کا ارشاد کہ وہ وقت ایسی ہی وصیّت کا تھا۔ کونسا عاقل تجویز کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس ۲۳ برس کی مدت میں کہ زمانہ آپ کی نبوت کا تھا اور کیسی رحمت اور رافت عام خلق اللہ خصوصاً اُمت کے حق میں رکھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ کہ قرآن امت کو پہنچایا اور بیشمار حدیثیں ارشاد کیں ایسے تنگ وقت میں کونسی ایسی چیز تھی کہ لکھنے سے رہ گئی تھی اور تریاق مجرب تھی دفع اختلاف کے واسطے اُس کو لکھتے یا لکھاتے اور عمرؓ کے منع کرنے سے رُک گئے۔ اور پانچ روز تک حیات رہے اور عمرؓ اصلاً وہاں موجود نہیں صرف اس وہم سے کہ مبادا عمرؓ سن لیں اور باہر دروازے پر کھڑے ہو کر ڈرائیں دھمکائیں حضرتؐ زبان پر نہ لائیں اور باوصف آمد و رفت اہل بیت کے اُس وقت بھی اُن سے نہ فرمائیں کہ ایسا نوشتہ لکھ کر رکھ چھوڑو۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (پاک ہے تو یہ بہت بڑا بہتان ہے)۔

اس کے علاوہ دلیل عقلی اس بیہودہ خیال کی بیہودگی پر یہ ہے کہ اگر پیغمبر یہ نوشتہ لکھنے کے واسطے قطعاً اور ضرورۃً جناب باری تعالیٰ سے مامور تھے باوصف اس قدر فرصت کے کہ باقی روز پنجشنبہ کا اور تمام دن جمعہ اور شنبہ اور یکشنبہ کے بخیریت گزرے کیوں نہیں اُس نوشتہ کے لکھانے میں متعرض ہوئے کہ اس سے تساہل لازم آتا ہے احکام الٰہی کے پہنچانے اور ادا کرنے میں جو خلاف آنجنابؐ سے حاشا من ذٰلک قولہ تعالیٰ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (اے رسول! پہنچا جو کچھ تجھ پر اُتارا گیا ہے تیرے پروردگار کی طرف سے اور اگر ایسا تو نے نہ کیا تو تو نے خدا کا پیغام ہی نہ پہنچایا اور خدا تیرا نگہبان ہے لوگوں کے شر سے)

پھر اس وقت جب کہ موت حیات پر غالب آ گئی تھی عمرؓ سے ڈرنا کیسا یعنے اطمینان ہوتا ہے وعدہ الٰہی سے کہ عصمت و محافظت کے ساتھ وارد ہے مَعَاذَ اللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔ اور اگر آپ اپنے اجتہاد سے چاہتے تھے کہ کچھ لکھیں تو آپ نے اُس اجتہاد سے رجوع فرمایا یا نہیں۔ در صورت شق اول یعنے رجوع فرمانے کے بالکل طعن زائل ہو گیا بلکہ تمام تمام موافقات عمری کی طرح منقلب منقبت ہو گیا بمنقبت یعِزُّ عَزِیزٌ اَوْ ذَلَّ ذَلِیْلٌ (ساتھ عزت پانے کسی عزیز یا ذلت پانے کسی ذلیل کے) ساتھ بصفت کمال۔ اور در صورت شق ثانی جو کچھ نافع ہے اس کا ترک لازم آیا اور یہ مصداق رحمت الٰہی کا نہ ہوا حاشا جَنَابَہٗ مِنْ ذٰلِکَ۔ قولہ تعالےٰ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (ترجمہ آیت بیشک آیا تمہارے پاس رسول تم میں سے کہ بھاری ہے اُس پر تمہارا رنج شفیق ہے تم پر اور مومنوں کے حق میں مہربان اور نرم دل)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ جو کتاب (نوشتہ) لکھنا چاہتے تھے یا تو کوئی نئی بات تھی جو تبلیغ سابق پر زائد تھی یا ناسخ اور مخالف اُس کا یا تاکید اُس کی۔ پہلی اور دوسری شق کی صورت میں تکذیب اس آیت کی ہوتی ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ اور تیسری شق میں امت کی کچھ تلفی نہیں ہوتی۔ اس سبب سے کہ تاکید پیغمبرؐ کی خدا کی تاکید سے بڑھ کر نہیں ہے اگر خدا کی تاکید کو گنتی میں نہ لائیں گے تو پیغمبرؐ کی تاکید سے اُن کے حق میں کیا کشود ہوگی۔

اور دلیل نقلی جو اس خیال کے بطلان پر ہے یہ ہے کہ روایت سعید بن جبیر میں ابن عباسؓ سے اسی قرطاس کی خبر میں آیا ہے اور صحیحین میں موجود ہے کہ:

اِشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَجَعُہٗ فَقَالَ ائْتُوْنِیْ بِکَتِفٍ اَکْتُبْ لَکُمْ کِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا فَتَنَازَعُوْا فَقَالُوْا مَا شَاْنُہٗ اَھَجَرَ اسْتَفْهِمُوْہُ فَذَھَبُوْا یَرُدُّوْنَ عَلَیْہِ فَقَالَ دَعُوْنِیْ فَالَّذِیْ اَنَا فِیْہِ خَیْرٌ مِّمَّا تَدْعُوْنِیْ اِلَیْہِ وَاَوْصَاھُمْ بِثَلَاثٍ قَالَ اَخْرِجُوا الْمُشْرِکِیْنَ مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ وَاَجِیْزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا کُنْتُ اُجِیْزُھُمْ وَسَکَتَ عَنِ الثَّالِثَۃِ

یعنے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آزار اور درد کی شدت ہوئی تو فرمایا لاؤ میرے پاس ہڈی شانے کی تو تم کو ایک نوشتہ لکھ دوں تاکہ بہک نہ جاؤ پھر کبھی تم آپس میں جھگڑا کیا اور کہا کہ آنحضرتؐ کو کیا ہو گیا ہے آیا بے خبروں کی طرح ہے پھر پوچھو اُن سے پس شروع کیا تکرار کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھوڑ دو مجھ کو اُس شغل میں کہ میں جس میں ہوں کہ وہ شغل اس سے بہتر ہے جس طرف مجھ کو بلاتے ہو اور تین وصیتیں کیں ایک یہ کہ نکال دو مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے اور انعام دو ایلچیوں کو جیسا کہ میں دیتا تھا ان کو

أو قال نسيتها وفي رواية وفي البيت رجال منهم عمر بن الخطاب قال قد غلب عليه الوجع وعندكم القرآن حسبكم كتاب الله.

یا کہا کہ میں اُس کو بھول گیا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ گھر میں مرد تھے اُن میں سے عمرؓ بن خطاب نے کہا کہ حضرتؐ پر مرض نے غلبہ کیا ہے اور تمہارے پاس قرآن کافی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے۔

اِس روایت سے بھی صریح معلوم ہوتا ہے کہ عمرؓ کے بولنے سے پہلے حاضرین نے تنازع کیا اور جو کچھ کہنا تھا کہہ لیا۔ اور پھر جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آپ نے اُس کو لوٹ کر دوات منگانے اور کتاب لکھنے سے سکوت فرمایا۔ اگر یہ بات قطعی یا موافق وحی کے ہوتی اور آپؐ سکوت فرماتے اور جاری نہ کرتے تو خلاف عصمت کے تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعد اس قصہ کے پانچ روز تک زندہ رہے اور روز دوشنبہ کو رفیق ملا اعلیٰ کے ہوئے کہ اس کے شیعہ بھی مقر ہیں۔ اگر وحی تھی تو اس کی تبلیغ کی اِس مدت میں فرصت پائی تھی پس معلوم ہوا کہ امور دین سے کچھ لکھنا منظور نہ تھا بلکہ سیاست مدینہ اور مصالح ملک اور تدبیرات دنیوی میں زبانی وصیت فرمائی۔ اور تیسری چیز کہ اس روایت میں فراموش شدہ لکھی ہے درستی سامان لشکر اسامہؓ کی ہے جو دوسری روایت سے ثابت ہے۔ اور اول دلیل اس مدعا پر یہ ہے کہ جب دوسری دفعہ اصحابؓ نے دوات وشانہ لانے کو پوچھا تو جواب دیا کہ قَالَ الَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ (تم چاہتے ہو کہ میں وصیت نامہ لکھوں اور میں اپنے باطن سے مشغول ہوں مشاہدہ حق تعالیٰ میں اور اس کے قرب مناجات میں جل شانہ) اور اگر امور دینیہ یا تبلیغ وحی کا منظور ہوتا پیچھے خیریت کے کیونکر درست ہوتے کیونکہ باجماع انبیاء کے حق میں وحی پہنچانے اور احکام دین جاری کرنے سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے۔ اور یہ بھی اِس روایت سے ظاہر ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری دفعہ جواب بے تعلقی اور آزادی خاطر کا اِس عالم سے اصحابؓ کو ارشاد فرمایا تو حاضرین کو یاس و حسرت دامنگیر ہوئی عمرؓ بن خطاب نے اُن کی تسلی کے واسطے یہ عبارت کہی کہ یہ جواب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا تمہارے حق میں عتاب غصہ کی راہ سے نہیں ہے بلکہ بسبب شدت درد کے ہے کہ جس سے تنگ مزاجی ہو گئی ہے۔ اور پیغمبرؐ کی آزادی سے مایوس مت ہو کہ اللہ کی کتاب شافی وکافی ہے تمہاری تعلیم اور تمہارے دین و ایمان کی نگہبانی کو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ یہ کلام عمرؓ بن خطاب کا بعد اس گفتگو کے مقام تسلی اصحابؓ میں واقع ہوا نہ کہ مخالفت کتابت میں۔ اور آخر کلام اِس مقام میں یہ ہے کہ حضرت امیرؓ بھی اس قصے میں حاضر تھے اِس پر اہل سیر سنی وشیعہ دونوں کا اجماع ہے۔ اور ہرگز انکار اُن کا عمرؓ پر اور حاضران مجلس پر کہ کتابت سے مخالفت کی تھی منقول نہیں ہوا نہ آپ کی حیات میں اور نہ بعد وفات آپؐ کے اُس زمانہ میں جو آپ کی خلافت کا

وقت تھا نہ کسی شیعہ سے نہ کسی سُنّی سے۔ پس اگر عمرؓ اِس کام میں خطا وار ہیں تو حضرت امیرؓ بھی اِس کام کے مجوز ہیں اور سوائے ابن عباسؓ کے کہ اُس وقت صغیر سن تھے کسی کا افسوس اور کسی کی حسرت منقول نہیں ہوئی۔ اگر کوئی امر عظیم اس ماجرے میں فوت ہوا ہوتا تو بڑے بڑے صحابہؓ اولی یہ کہ حضرت امیرؓ خود اُس کا ذکر فرماتے اور حسرت ظاہر کرتے اور شکایت اِس مانعت کی زبان پر لاتے۔

اگر اِس موقع پر کسی کے دل میں یہ شبہ گزرے کہ اگر کوئی امر عظیم نہایت دین سے اس لکھنے میں منظور پیغمبرؐ نہ تھا تو یہ کیوں فرمایا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ ؟ اِس واسطے کہ یہ لفظ صریح اِس پر دلالت کرتا ہے کہ نوشتے کے لکھ جانے سے تم گمراہ نہیں ہوگے اور معنی گمراہی کے یہی ہیں کہ دین میں خلل پڑے۔

جواب اِس شبہ کا یہ ہے کہ لفظ ضَلَال لُغتِ عرب میں جیسا معنے گمراہی در دین کے آیا ہے ویسے ہی دنیا کے معاملات میں بد تدبیری کے معنے میں بھی بہت مستعمل ہے۔ مثال اُس کی کلام الٰہی میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی طرف سے حضرت یعقوبؑ کے حق میں علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ سورۂ یوسف میں مذکور ہے قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ (کہا یوسفؑ کے بھائیوں نے مر آئینہ یوسفؑ اور اُس کا حقیقی بھائی باپ کو ہم سے زیادہ دوست ہے اور ہم مرد قوی ہیں بیشک ہمارے باپ غلطی صریح میں ہیں) نیز اسی سورۃ میں دوسری جگہ فرمایا کہ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (بیشک تو اُسی اپنی غلطی قدیم میں ہے) ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی کافر نہ تھے کہ اپنے پدر بزرگوار کو کہ پیغمبر عالی مرتبہ تھے گمراہ دین اعتقاد کریں مَعَاذَ اللّٰهِ مِنْ ظَنِّ الْفَاسِدِيْنَ۔ مراد ان کی بے تدبیری معاملات دنیوی کی تھی کہ کام کرنے والے لڑکوں کو کہ ہر طرح کی خدمتیں بجالاتے ہیں ایسا دوست نہیں رکھتے جیسا خورد سال لڑکوں کو کم محنت قاصر الخدمت کو نوبت عشق کی پہنچائی ہے۔ پس یہاں بھی مراد تَضِلُّوْا سے خطا تدبیر ملک میں ہے نہ کہ گمراہی دین۔

اور دلیل قطعی اِس ارادے پر یہ ہے کہ تیئیس برس کی مدت اور وحی اور قرآن کا نزول اور پہنچانا حدیثوں کا اگر ان کی ہدایت اور دفع گمراہی کو کافی نہیں ہو تو یہ دو تین سطریں اس لوح کیونکر کافی اس کام میں ہو سکتی ہیں۔

بعضوں کے دل میں اِس موقع پر یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ شاید آنجنابؐ کو امر خلافت کا لکھنا منظور ہو عمرؓ کی مانعت سے یہ امر عظیم توقف میں پڑ گیا تو ہم کہتے ہیں کہ اگر امر خلافت کا لکھنا منظور ہو دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا خلافت ابوبکرؓ کی یا خلافت حضرت امیرؓ کی۔ اوّل صورت میں یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مرض میں ابوبکرؓ کے واسطے ارادہ دل میں کر کے خود بخود موقوف کیا

اس لئے کہ عمرؓ نے منع کیا ہو بلکہ خدا اور مسلمانوں کے اجماع پر حوالے کیا۔ اور جانا کہ یہ مقصود خود ہی حاصل ہو جائے گا پھر حاجت لکھنے کی کیا ہے۔ صحیح مسلم میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مرض میں عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ:

ادْعِي لِي أَبَاكِ وَأَخَاكِ أَكْتُبُ كِتَابًا فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يَتَمَنَّى مُتَمَنٍّ وَيَقُولُ قَائِلٌ أَنَا أَوْلَى وَيَأْبَى اللهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍؓ

بلا میرے پاس اپنے باپ اور بھائی کو تاکہ میں وصیت نامہ لکھ دوں میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ کوئی آرزو کرنے والا آرزو کرے یا کوئی کہنے والا کہے کہ میں ہی ہوں اور کوئی نہیں۔ اور خدا اور مؤمنین کسی کو قبول نہ کریں گے مگر ابوبکرؓ کو۔

یہاں حضرت عمرؓ کب موجود تھے کہ وصیت نامہ لکھنے سے ممانعت کی ہے۔ اور دوسری صورت میں حاجت لکھنے کی نہ تھی اس واسطے کہ قبل اس واقعہ سے ہزاروں آدمیوں کے سامنے میدان غدیر خم میں مقدمہ ولایت امیر المؤمنینؓ کا فرمایا تھا اور امیر المؤمنینؓ کو مولا ہر مومن اور مومنہ کا فرمایا اور یہ قصہ تمام جہان میں مشہور اور زبان زد خلائق ہوا تھا۔ اگر باوصف اس تقید و تاکید اور شہرت اور تواتر کے اس پر عمل نہ کریں تو اس خانگی لکھنے سے کہ چند آدمی سے زیادہ وہاں حاضر نہ ہوں گے کیا کشود حاصل ہوگی۔

حاصل کلام کسی صورت سے اس نوشتہ کے منع کرنے میں حق امت کا باطل نہیں ہوا۔ اور دین کا کام کوئی چھپے نہیں رہے۔ اور یہ خیال باطل ہو جیسا مثل خیال غیبت امام مہدیؑ کے ہے کہ بالکل وسوسہ ہے اور وسواس کا کچھ علاج نہیں۔

طعن دوم: یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکان حضرت سیدۃ النساءؓ کا جلا دیا اور اُن کے شکم مبارک پر اپنی تلوار سے ایسا صدمہ پہنچایا کہ حمل ساقط ہوا۔

یہ قصہ بالکل واہی اور بہتان اور سراسر افترا ہے اس کی کچھ اصل نہیں۔ اسی واسطے اکثر امامیہ اس قصے کے قائل نہیں ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ قصد مکان مبارک جلانے کا کیا تھا لیکن جلایا نہیں۔ ظاہر ہے کہ قصد امور قلبیہ سے ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے اس سے کوئی واقف نہیں ہوتا۔ اور اگر مراد اُن کی قصد سے زبانی ڈرانا دھمکانا ہے کہ جلا دوں گا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دھمکی اور ڈرانے سے اُن لوگوں کا ڈرانا منظور تھا کہ اہل خیانت نے آپ کے مکان کو امن و پناہ کی جگہ جان کر حکم حرم مکہ معظمہ کا دیا تھا۔ اور وہاں جمع ہو کر خلیفہ اولؓ کی خلافت توڑ پھوڑ کرنے کے واسطے صلاحیں اور مشورے فساد انگیز کرتے تھے اور فساد و فتنہ اٹھایا چاہتے تھے۔ حضرت زہراؓ بھی ان کی اس نشست برخاست سے کدر و ناخوش تھیں لیکن بسبب کمال حسن خلق کے ظاہر اُن سے نہیں فرماتی تھیں کہ یہاں سے کمر مت آؤ۔ عمر بن خطابؓ نے جب حال

دیکھا تو اس گروہ سے دھمکا کر کہا کہ میں اس گھر کو تم پر جلا دوں گا مگر پھر ان کے جانے پاتو اور خصوصیت جلانے کی اس تہدید میں موافق حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہے اور اسی سے مستنبط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے تھے اور امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے ایسا ہی ارشاد فرمایا تھا کہ اگر یہ گروہ ترک جماعت سے باز نہ آئے تو میں ان کا گھر ان پر پھونک دوں گا۔ اور چونکہ ابوبکرؓ بھی امام نماز مقرر کئے ہوئے حضرت پیغمبرؐ کے تھے اور وہ لوگ ان کی اقتدا بھی کو ترک کرنا تجویز کرتے تھے اور رفاقت جماعت مسلمانوں کی اس امر میں نہیں کرتے تھے پس یہ قول حضرت عمرؓ کا بھی مشابہ قول پیغمبر کے ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کے علاوہ فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں عرض کیا گیا کہ ابن خطل جو شعرائے کفار سے تھا اور بارہا اپنے شعروں میں ہجو آپ کی لکھ کر اپنا منہ کالا کر رہا تھا خانۂ کعبہ میں اس کے پردوں میں جہاں تجلی کا آشیانہ ہے چھپا ہے اس کے مقدمہ میں کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ اس کو وہیں مار ڈالو اور کچھ پاس کسی بات کا نہ کرو۔ اور جب ایسے مردود دین کو جناب الٰہی کو خانۂ خدا میں پناہ نہ ہو تو حضرت زہراؓ کے گھر میں کیوں پناہ ملنا چاہیے۔ اور حضرت زہراؓ ایسے شریر مفسدوں کے سزا دینے سے کب ملول ہوں گی کہ تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (خدا کی عادتوں کے موافق عادت اختیار کرو) آپ کی طینت پاک کا شیوہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ صحیح خبروں سے ثابت ہے کہ حضرت زہراؓ بھی ان لوگوں کو اس جہاد سے منع کرتی تھیں۔

نیز قول حضرت عمرؓ کا اس موقع پر حضرت امیرؓ کے فعل سے بہت گھٹ کر ہے کہ جب بعد شہید ہونے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آپ کی خلافت ٹھہری تو جو لوگ کہ ارادہ برہم کرنے اس منصب عظیم کا دل میں رکھتے تھے مدینہ سے نکل کر مکہ کو دوڑے۔ اور پناہ سایۂ حرم محترم رسول یعنی ام المومنین عائشہ صدیقہؓ میں داخل ہو کر دعوائے قصاص عثمانؓ کا ان کے قاتلوں سے کر کے آمادہ جنگ و پیکار ہوئے تھے۔ حضرت امیرؓ نے ان کو قتل کیا اور کچھ پاس حرم محترم رسول اور رعایت دل اپنی ماں ام المومنینؓ کا جو بموجب نص قرآن کے ہے نہ فرمایا۔ ہر چند جیسے کچھ ذلت اہانت اور آسیب صدمہ حرم محترم رسول نے اٹھایا اظہر من الشمس ہے۔ اور واقعی حضرت امیرؓ نے جو کچھ کیا نہایت ٹھیک اور خالص حق تھا کہ ایسے بڑے کاموں میں جس میں فتنہ اور فساد عام ہو جزئی مصلحتوں کی رعایت کر کے اس کے مقدموں اور مبادی کو چھوڑ دینا اور تدارک نہ کرنا کمال بے انتظامی امور دین و دنیا کی ہے۔ پس جیسا کہ گھر حضرت زہراؓ کا واجب التعظیم اور احترام تھا ام المومنینؓ اور حرم محترم رسول اور زوجہ محبوبہ آنحضرت کہ محبوب الٰہی تھی یہ بھی واجب التعظیم احترام تھا بلکہ عمرؓ نے صرف قول اور تخویف واسطے ڈرانے

وقوع میں آئی اور حضرت امیرؓ نے تو اس فعل کو بھی حد درجہ کو پہنچا دیا۔ پس اس مقام میں زبان طعن کی حضرت عمرؓ پر بڑھا دینا حالانکہ ان کا قول فعل حضرت امیرؓ سے بدرجہا گھٹا ہوا ہے سوائے تعصب و عناد کے اور بنیاد اس کی کیا ہے۔

اب اگر اہل سنت کے مقابلہ میں یہ فرق پیدا کیا جائے کہ خلافت امیرؓ کی حق تھی لہٰذا اس کا حفظ انتظام تو ضروری تھا اور پاس ام المومنینؓ اور تعظیم حرم رسول کی سب ساقط ہو گئی لیکن خلافت ابوبکرؓ کی ناحق تھی عمرؓ نے اس خلافت فاسدہ کا پاس کیا اور اس کے حفظ انتظام کے واسطے حضرت زہراؓ بنت رسول کے گھر کا لحاظ نہ کیا کہ وبال پر وبال ہے یہ سب ان کی نہایت بے عقلی و نادانی ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک دونوں خلافتیں برابر ہیں دونوں کو حق جانتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت طعن عمرؓ بن خطاب کی طرف متوجہ ہوتا عمرؓ کے نزدیک جو خلافت ابوبکرؓ کی مقرر بحقیقت تھی یعنی انہی کا حق تھا اور اس وقت کوئی جھگڑالو اور مخالف کہ ابوبکرؓ کا ہم جنب ہوتا یعنی برابر والا اور یہ اس کی مخالفت کی پرواہ کرتے اور گنتی میں نہ لاتے۔ بنیاد ایسی خلافت منتظمہ کی کہ اول جوش اسلام کا تھا اور وقت نشوونما حال دین اور ایمان کا برہم کرنا اور ارادے فاسد سوچنا ضرور موجب قتل و تعزیر نہیں تو کم سے کم موجب ڈرانے دھمکانے کا تو ہے۔

اور عجب یہ ہے کہ بعض فضلائے شیعہ نے اس طعن میں بطور ترقی کے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی زبیرؓ بن عوام بھی منجملہ ان جوانوں بنی ہاشم کے تھے جن کے ڈرانے دھمکانے کو حضرت عمرؓ نے یہ بات کہی تھی کہ بعد اس کے حضرت زہراؓ نے ان جوانوں بنی ہاشم اور حضرت زبیرؓ کو جواب دیا کہ اب ہمارے گھر میں ایسی مجلس اور مجمع مت کرو۔ سبحان اللہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ خلافت ابوبکرؓ میں اگر زبیرؓ بن عوام تدبیر فساد ڈالنے کی کریں تو معصوم واجب التعظیم ہوں۔ اور حضرت عثمانؓ کے قصاص چاہنے میں اگر سخت بات منہ سے نکالیں تو واجب القتل اور تعزیر ہوں۔ اور جو حضرت زہراؓ کے گھر میں بیٹھ کر ایسے ارادے فساد اور صلاحیں فتنہ انگیزی کی کریں وہ تو واجب القبول ہوں اور جب حضور میں حرم محترم حضرت رسول کی اور ہمراہ ان کے ہوں کہ بلاشبہ وہ ام المومنین ہیں دعوائے قصاص یا شکایت قاتلان عثمانؓ کے قاتلوں کی زبان پر لائیں تو وہ واجب الرد اور ازالہ ہوں۔

پس یہ فرق تو مبنی بر اصول شیعہ ہے۔ اور اگر چاہیں کہ اہل سنت کو اپنے طریق پر الزام دیں تو کیوں اتنی دور دوڑتے پھریں بس ایک بات کافی ہے۔ اور جب کہ ترک جماعت پر کہ سنت مؤکدہ ہے اور فائدہ اس کا فقط اسی کے واسطے ہے جس پر یہ تکلیف شرعی ہے اور اس کے ترک سے مسلمانوں کو کچھ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور الگ الگ نہ ہو

تصفیہ مابین سُنّی و شیعہ

تالیفِ لطیف

عالمِ ربانی حضرت قبلہ عالم خواجہ سید پیر مہر علی شاہ صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

○

بایماء

حضرت سید پیر غلام محی الدین شاہ صاحب قدس سرہٗ

○

باہتمام

جناب سید پیر غلام معین الدین شاہ صاحب مدظلہ العالی

○

۲۔ حدیثِ قرطاس

بروایت ابن عباس حدیث قرطاس کا ذکر صحیح بخاری میں دو جگہ آیا ہے۔ اس مقام پر ان دونوں احادیث شریفہ کو بلفظہٖ نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ناظرین کے لیے اس واقعہ کی اصلیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ان طعن کنندگان کی کم علمی اور کم فہمی بخوبی ظاہر ہو جائے۔ اور مشتے نمونہ از خروارے کی طرح سارے مطاعن کی حقیقت بھی کھل جائے۔ پہلی حدیث یہ ہے:۔

عن ابن عباس رضي الله عنه قال لما حضر رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي البيت رجال فيهم عمر بن الخطاب قال النبي صلى الله عليه وسلم هلم اكتب لكم كتابا لا تضلوا بعده فقال عمر ان النبي صلى الله عليه وسلم قد غلب عليه الوجع وعندكم القرآن حسبنا كتاب الله فاختلف اهل البيت فاختصموا منهم من يقول قربوا يكتب لكم النبي صلى الله عليه وسلم كتابا لن تضلوا بعده ومنهم من يقول ما قال عمر فلما اكثروا اللغو والاختلاف عند النبي صلى الله عليه وسلم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قوموا قال عبيد الله فكان ابن عباس يقول ان الرزية كل الرزية ما حال بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين ان يكتب لهم ذلك الكتاب من اختلافهم ولغطهم۔ (صحیح بخاری کتاب الطب)

ترجمہ: عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت آیا اور دولت کدہ میں لوگ جمع تھے جن میں جناب عمرؓ بن الخطاب بھی تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آؤ میں تمھیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے پس حضرت عمرؓ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درد غالب ہو گیا ہے اور تمھارے پاس قرآن ہے اور کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے پس گھر والوں نے اختلاف کیا اور آپس میں جھگڑ پڑے بعض کہتے تھے کہ سامان کتابت پاس رکھ دو تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے لیے ایسی تحریر لکھ دیں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اور بعض ویسا کہتے تھے جیسا کہ عمرؓ نے کہا پس جب انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شور و اختلاف زیادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اٹھ جاؤ۔ عبید اللہ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے تھے کہ مصیبت بڑی مصیبت وہ چیز ہے جو بسبب ان کے اختلاف اور شور کے حائل ہو گئی درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے کہ آپ ان کے لیے وہ تحریر لکھتے۔

دوسری حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن سعيد بن جبير قال قال ابن عباس يوم الخميس وما يوم الخميس اشتد برسول الله صلى الله عليه وسلم وجعه فقال ائتوني اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده ابدا فتنازعوا ولا ينبغي عند نبي تنازع فقالوا ما شانه اهجر

۱؎ یہ بھی قابل غور ہے کہ بخاری میں فقط ابن عباسؓ کی روایت میں اس اختلاف کا ذکر ہے جو وفات نبوی کے وقت نابالغ کمسن تھے دیگر کسی بالغ مرد سے یہ روایت نہیں۔

ستفهموہ فذھبوا یردون علیہ فقال دعونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ واوصاھم بثلاث قال اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم۔ وسکت عن الثالثۃ او قال فنسیتھا۔

(صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و وفاتہ)

ترجمہ: سعیدؓ بن جبیر سے روایت ہے کہ کہا ابن عباسؓ نے پنجشنبہ کا دن اور کیسا عجیب اور سخت تھا پنجشنبہ کا دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کا درد شدت اختیار کر گیا پس آپ نے فرمایا سامان کتابت میرے پاس لاؤ میں تمہارے لیے ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے پس حاضرین نے جھگڑا اور اختلاف کیا اور کسی نبی کے پاس جھگڑا اور اختلاف مناسب نہیں پس بعض نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک اور حال کیا ہے؟ کیا کبھی آپ کی زبان مبارک سے پریشان کلام یا ہذیان نکلا ہے؟ آپ سے دریافت کر لو پس وہ معاملہ کتابت کو آپ پر دوبارہ پیش کرنے لگے۔ اس پر آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو کیونکہ میں جس حالت (مشاہدۂ حق) میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔ اور آپ نے ان کو تین باتوں کی وصیت فرمائی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور ایلچیوں کو انعام دو جیسے میں دیا کرتا تھا اور تیسری بات کے متعلق سعیدؓ بن جبیر چپ رہے یا راوی کہتا ہے کہ میں بھول گیا۔

ان روایات کا لب لباب یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا اور دولت خانہ شریف میں لوگ جمع تھے جن میں عمرؓ بن الخطاب بھی تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سامان کتابت میرے پاس لاؤ میں تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے۔ حاضرین میں اس پر اختلاف ہو گیا بعض جن میں عمرؓ بن الخطاب بھی تھے کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد غالب ہے آپ کو تکلیف نہ دو۔ اور ہمارے پاس کتاب ہے اور کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ اور دوسرے کہتے تھے کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل کی جائے۔ آپ کی زبان مبارک سے کبھی پریشان کلام نہیں نکلا۔ دوبارہ دریافت کر لو۔ جب شور و اختلاف زیادہ ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ اور مجھے میرے حال (مشاہدۂ حق) پر چھوڑ دو۔

حدیثِ قرطاس سے اخذ کردہ غیر صحیح نتائج

ان احادیث کے معانی کے سمجھنے میں دانستہ یا نادانستہ غلطی کی وجہ سے جو نتائج غیر صحیح نکالے گئے وہ یوں ہیں:۔

۱۔ مرض وفات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کاغذ طلب فرمانا یقیناً کسی دینی امر کے لیے تھا جو امت کو گمراہی سے بچانے کے لیے نہایت اہم تھا۔ ایسی تحریر کو روکنا اعلیٰ درجہ کا ظلم ہے اور مظالم کثیرہ کے لیے بنیاد ہے۔

۲۔ کاغذ طلب کرنے کے وقت آپ باہوش اور صحیح الحواس تھے۔ ایسے نہ تھے کہ مغلوب مرض ہو کر معاذ اللہ ہذیان کا شکار تھے۔ عمرؓ فاروق حسبنا کتاب اللہ کہہ کر اس تحریر کے مانع ہوئے جس سے ایسا شور و غل برپا ہوا کہ حضور اقدس نے بیزار ہو کر فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تحریری طور پر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ اس واقعہ سے کئی مہینے پہلے غدیر خم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپ بحضور کل صحابہ مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم "من کنت مولاہ فعلی مولاہ"..... فرما کر خلیفہ بنا چکے تھے۔ اب اسی کی تائید بذریعہ تحریر فرمانے کا ارادہ تھا۔ اور عمرؓ فاروق کو چونکہ یقیناً معلوم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

علی کرم اللہ وجہہ کو تحریری دستاویز عطا فرمانے لگے ہیں لہٰذا انھوں نے یہ دستاویز لکھنے نہ دی یہی ایک موقع کیا حضرت عمرؓ تو ہمیشہ حضرت علیؓ کے مخالف رہے اور سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت علیؓ کو خلافت بلافصل سے محروم رکھا اور اپنی زندگی میں علی مرتضیٰؓ کو اپنے سے دور رکھا اور اپنے بعد بھی اپنی لاجواب منصوبہ بندی سے انھیں خلیفہ نہ بننے دیا۔

۴۔ اہلِ سُنّت کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو تحریری دستاویز عطا فرما کر اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ مگر یہ ان کا خیال کا خیال ہے۔ ان کے پاس اس کی صداقت کی کوئی دلیل نہیں۔

۵۔ اہلِ سُنّت نے مشہور حدیث اِنّی تارِکٌ فیکم الثقلین ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی کتاب اللّٰہ وعترتی اهل بیتی[1] پر عمل نہ کیا بلکہ فقط امامیہ کو اس پر عمل کرنا نصیب ہوا۔

ان نتائج غیر صحیحہ کے جوابات

پہلے اور دوسرے نتائج (متعلقہ حدیث قرطاس) کا جواب

یہ تو ظاہر ہے کہ جس بات کو آپ لکھنا چاہتے تھے اگر اس پر اُمت کی اصلی یا دائمی ہدایت کا دارومدار ہوتا تو آپ اُسے ہرگز ہرگز ترک نہ فرماتے۔ یہ آپ کی شان ہادی، مُبلّغ، بشیر، نذیر، حریصٌ علیکم وغیرہ اوصافِ منصوصہ کے سراسر خلاف ہے کہ آپ ایک ایسے امر کو پورے تین دن جمعہ، شنبہ، یک شنبہ معہ بقیہ دو شنبہ کی مہلت میں ترک فرما دیں پھر خطاب اور ارشادِ نبوی سب حاضرین کے لیے تھا جن میں سیدنا علیؓ اور سیدنا عباسؓ بھی تھے نہ صرف حضرت عمرؓ کے لیے ہی خطاب تھا۔ اگر مطعون ٹھہریں گے تو سب نہ صرف اکیلے حضرت عمرؓ بلکہ سب سے زیادہ سیدنا علیؓ پر مطاعن اور نتائج فاسدہ کا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ دولت خانۂ نبوی پر حضرت علیؓ ہی کتابتِ وحی کا کام کرتے تھے۔ وہ خطابات اسد اللہ الغالب، خیبر شکن اور لافتیٰ اِلّا علی وغیرہ سے ملقب تھے یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی سے ڈر کر یا کسی کے رعب میں آکر تعمیلِ ارشادِ نبوی سے گریز کیا ہو۔ اگر بالفرض محال ایسا تھا بھی، پھر بھی کامل تین دن میں حضرت عمرؓ سے علیحدگی کے وقت انھیں تعمیل کا موقع مل سکتا تھا۔ حاضرین میں سے کسی کا بھی تعمیل نہ کرنا صاف بتلاتا ہے کہ کتابت زیرِ بحث ضروری نہ تھی ورنہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو بالاتفاق معصوم ہیں کسی کے روکنے سے کب رُک سکتے تھے۔

اس کتابت کے غیر ضروری ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ جب معاملہ کتابت دوسری دفعہ پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے لیے اس تحریر سے مشاہدۂ حق بہتر ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلّم امر ہے کہ انبیائے کرام کے حق میں تبلیغ اوامر و نواہی الٰہیہ سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل تین دن کے عرصہ میں معاملۂ کتابت کی طرف تعرض نہ فرمانا باوجود اس امر کے اہم بالشان ہونے کے جیسا کہ جملہ لن تضلوا بعدہٗ اس پر دال ہے اس لیے ہوا کہ آپ کو حسبِ وعدۂ الٰہیہ مندرجہ آیت استخلاف پورا اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ انھی بعض حاضرین مذہبیہ کو خلیفہ بنا کر خوف سے امن عطا کرے گا اور انھی کے ہاتھوں پر اپنے پسندیدہ

---

[1] میں تم میں دو بڑی باعظمت چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک اُن سے تمسک کرو گے اور اُن کی تابعداری کرو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے وہ دو چیزیں اللہ کی کتاب اور میرے اہلِ بیت ہیں۔

دین کو قائم فرما کر سب ادیان پر غالب کرے گا۔ اس وجہ سے کہ وہ بجملہ وحی ہو گئی تھی۔ جس وجہ اس لیے کہ گو آیتِ استخلاف میں ناموں کی تصریح نہیں تھی مگر آیت میں مخاطبین کا خلیفہ بننا موجب عدم ضرورت تحریر ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وجوب تبلیغ تحریری سے بجملہ وحی ہو لی اور ارشاد پاک در بارہ تحریر احتیاطی تھا نہ وجوبی۔ گویا تین دن کا عدم تحریر محض حسبنا کتاب اللہ کے سہارے پر تھا جو محدثِ امت[۱] سیدنا عمرؓ کی زبانِ حق ترجمان سے ظاہر ہوا۔ اور تقریباً در سلک تطابق وحی بارائے عمرؓ منسلک ہوا۔

حضرت عمرؓ کو محلِ طعن بنانے والوں نے دو غلطیاں کی ہیں۔ ایک تو اُن کے کلام کا مطلب ایسے زہریلے رنگ میں ادا کیا ہے جو کوئی منافق بھی اس وقت کے منافقین میں سے نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا "اَھَجَرَ اسْتَفْھِمُوْہُ" یعنی کیا حضورؐ پریشان کلام کر سکتے ہیں؟ دوبارہ دریافت کر لو، کا جملہ بھی مخالفین نے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا ہے جو خلافِ واقعہ ہے۔ بالفرض اسے صحیح مان لیا جائے تو بھی کوئی الزام عائد نہیں ہوتا کیونکہ یہ جملہ استفہام انکاری ہے اور در صورت ہذیان و بے ہوشی یہ جملہ "اور دریافت کر لو" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپؐ کی حالت ہذیان کی نہیں، کیونکہ یہ شانِ نبوت سے بعید ہے۔ دوبارہ دریافت کر لو۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں ایک اور اعتراض کے جواب میں بھی یہاں کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حدیثِ قرطاس میں حاضرین بیتِ نبوت کا آپس میں تنازع اور اختلاف آیۂ کریمہ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (تم اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند نہ کرو) کے خلاف نہیں کہ جیسا فرمان اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ اُن کے اعمال کو حبوط اور کالعدم سمجھا جائے، کیونکہ وہاں حاضرین میں سے بعض ایک گروہ دوسرے گروہ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرتا رہا اور قرآن کریم میں یوں نہیں آیا کہ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ بَيْنَكُمْ عِنْدَ النَّبِيِّ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تم آپس میں اپنی آوازیں بلند نہ کرو۔ اور حدیثِ قرطاس میں لَا یَنْبَغِیْ آیا ہے جس سے ایسا کرنا ترکِ اولیٰ معلوم ہوتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ تم میرے پاس سے اُٹھ جاؤ از راہِ نصیحت تھا یا بوجہ ناسازیٔ طبع تھا۔

تیسرے شبہ (متعلقہ حدیث خمِ غدیر) کا جواب

روایت ہے کہ خمِ[۲] غدیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بمجمعِ کل صحابہ کرامؓ سب کو مخاطب بنایا اور فرمایا الستم تعلمون انی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم (کیا تم نہیں جانتے کہ میں ایمان والوں سے بہ نسبت اُن کے نفوس کے نزدیک تر اور دوست تر ہوں یعنی میں مومنوں کا خیر خواہ ہوں اور اُن کو انہی امور کی ہدایت کرتا ہوں جو اُن کے لیے موجب فلاح و نجات و بہتری ہوں۔ اس کے جواب میں سب نے عرض کیا بلیٰ یا رسول اللہ یعنی یقیناً آپ صحیح فرماتے ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا گویا مجھے اُس عالم میں بلایا گیا ہے اور میں نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ جان لو کہ میں تمہارے درمیان دو عظیم الشان امر چھوڑے جاتا ہوں یعنی قرآن اور میرے اہلِ بیت۔ خبردار، ہوش کرنا اور میرے جانے کے بعد اُن کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور اُن کے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھنا۔ اور یہ دونوں امر میرے بعد ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے

۱؎ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد کان فیما قبلکم من الامم محدثون فان یک فی امتی احد فانہ عمر۔ (بخاری و مسلم) پہلی امتوں میں محدث لوگ ہوتے تھے۔ میری امت میں عمرؓ ہیں یعنی جنہیں خدا کی طرف سے امور واقعی کا القاء ہوتا ہے اور جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوتے ہیں۔

۲؎ ایک جگہ کا نام جہاں پانی کا جوہڑ تھا۔ فیق

یہاں تک کہ سب حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے" بعد ازاں فرمایا "میرا مولا خدائے عزوجل ہے اور میں سب مومنوں کا مولا ہوں" پھر سیدنا علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ اللّٰھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ (اے اللہ جس کا مولا میں ہوں علیؓ بھی اُس کا مولا ہے۔ اے اللہ اُس کو دوست رکھ جو علیؓ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اُس کو جو علیؓ سے عداوت رکھے)

ایک اور روایت میں علاوہ فرمان پاک مذکور یہ بھی آیا ہے۔ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق حیث دار (مدد کر اُس کی جو علیؓ کی مدد کرے اور رُسوا کر اُسے جو علیؓ کو رُسوا کرے اور حق کو علیؓ کے ساتھ رکھ یعنی جدھر علیؓ جائے اُدھر حق کو لے جا)

بلاشبہ اس حدیث شریف سے بدیہی طور پر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی غایت درجہ فضیلت اور تکریم ظاہر ہوتی ہے۔ اور ہر اہلِ ایمان کے لیے ترغیب بھی ہے کہ وہ حضرت پاک کے ساتھ اُسی طرح محبت رکھے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ کہ اس پر ایمان کا دارومدار ہے۔ اس کے سُننے کے بعد سیدنا عمرؓ نے سیدنا علیؓ سے اثنائے ملاقات کہا کہ اے ابوطالب کے بیٹے خوش ہو اور تجھے بشارت ہو کہ تو ہر مومن مرد اور مومنہ عورت کا مولا ہو گیا ہے۔

اس حدیث شریف کی تقریب کے متعلق بُریدہ اسلمی سے روایت ہے کہ آنحضرت نے سیدنا علیؓ کو لشکر دے کر یمن بھیجا تھا۔ اور میں بھی اُس لشکر میں تھا۔ فتح کے بعد جب خمس (مالِ غنیمت کا وہ حصہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت وغیرہ کے لیے تھا) غنائم سے علیحدہ کیا گیا تو سیدنا علیؓ نے قیدیوں میں سے ایک نہایت خوبصورت لونڈی لے کر اپنی صحبت میں رکھی۔ اُن کے ایسا کرنے سے میرے دل میں اُن کی طرف سے کدورت اور انکار پیدا ہوا۔ میں نے خالد بن ولید سے کہا "تم نے دیکھا یہ مرد (علیؓ) کیا کر رہا ہے؟" اور سیدنا علیؓ سے بھی میں نے کہا "یا ابا الحسنؓ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" آپؓ نے فرمایا کہ "یہ جاریہ (لونڈی) قیدیوں کے خمس (پانچویں حصے) اور مالِ غنیمت میں آئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں سے علیؓ کے حصہ میں آگئی اور میں نے اُسے اپنی صحبت میں رکھا ہے۔" گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خمس ذوی القربیٰ کے تقسیم کرنے کا اذن سیدنا علیؓ کو حاصل تھا۔

بُریدہ کا بیان ہے کہ جب واپسی پر میں خُم غدیر میں حضورِ نبویؐ میں حاضر ہوا تو میں نے وہاں بھی یہ ماجرا عرض کیا۔ آں حضرتؐ نے فرمایا "اے بُریدہ شاید تُو نے علیؓ کو دشمن جانا" میں نے عرض کیا "ہاں رسول اللہ" اس پر آپؐ نے فرمایا "اے بُریدہ علیؓ کو دشمن نہ سمجھ۔ اور اگر پہلے اُس سے کچھ محبت رکھتا ہے تو اب اُس سے زیادہ محبت رکھ۔ علیؓ کا حصہ خمس میں سے اُس لونڈی کے علاوہ اور بھی تھا۔"

بُریدہ سے اسی واقعہ کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ میری بات سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا۔ اور آپؐ نے فرمایا "اے بُریدہ! علیؓ کی طرف سے بدگمان نہ ہو۔ علیؓ مجھ سے ہے اور میں علیؓ سے ہوں (یعنی کمال اتحاد) اور وہ تمہارا مولا ہے کیونکہ جس کا مولا میں ہوں علیؓ بھی اُس کا مولا ہے۔"

خُم غدیر کے واقعہ کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی من کنت مولاہ فعلی مولاہ بُریدہ کی شکایت کی وجہ سے تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ علیؓ سے دوستی در حقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی ہے۔

لے واضح ہو کہ لفظ مولیٰ بہت سے معنوں میں مستعمل ہے یہاں مولیٰ بمعنی محب و ناصر ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہے فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ یہاں جبریلؑ اور نیک مومنوں کو نبی کریمؐ کا مولا قرار دیا گیا ہے جس کا معنی وہی محب و ناصر ہے نہ سید و سردار جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے ۱۲

شیعہ فرقے کے باطل عقائد اور اُن کے ردّ پر ایک بہترین کتاب

مذہب شیعہ

تحریر: حضور شیخ الاسلام حضرت خواجہ
محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

سب بکنے والوں کو مسلمانوں کی جماعت سے بھی خارج فرمایا اور یہ بھی مسلم ہے کہ ائمہ طاہرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس اور مقدس دلوں میں غیر خدا کا خوف نہیں آسکتا تھا اور و لا تخافو هم و خافون ان کنتم مؤمنین (اگر تم مومن ہو تو میرے بغیر کسی سے نہ ڈرو) پر ان کا پورا ایمان تھا۔ اور میدان کربلا میں اپنے اس ایمان کا ثبوت عملی طور پر بھی دیا تو وہ تمام تر ارشادات جو ائمہ طاہرین نے فرمائے اور تمام تر اخوت و مودت کے جو عملی ثبوت بہم پہنچائے صرف صدق و صفا اور ظاہری باطنی صداقت ہی کی بنا پر فرمائے۔ خلافت خلفائے سابقین کے متعلق جن واضح اور غیر مبہم کلمات طیبات کے ساتھ حضرت سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے قطعی فیصلہ ارشاد فرمایا ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں اس کے بعد فتنہ اور فساد پیدا کرنا اور وہ فیصلہ تسلیم نہ کرنا اور خلفائے راشدین کی شان اقدس میں سب و شتم بکنا اور محب علی کہلوانا حضرت علی کو (معاذ اللہ) جھٹلانا اور پھر دعوے تولی (محبت) کرنا ایمان تو کجا خود کسی معقولیت پر بھی مبنی نہیں ہو سکتا۔

حدیث قرطاس

بے خبر اور ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے کبھی قرطاس کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ حضرت اقدس ﷺ نے اپنی ظاہری حیوۃ طیبہ کے آخری خمیس کو اپنے حرم سرا میں اہل بیت کے مردوں سے کہا کہ لکھنے کے لئے کوئی چیز (دوات، قلم، کاغذ) لاؤ میں تمہارے لئے کچھ وصیت لکھوں تاکہ میرے بعد تم صراط مستقیم پر ثابت قدم رہو۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے مسجد شریف میں جا کر دوات قلم طلب فرمائی تو امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہمیں قرآن کریم کافی ہے کیا آنحضرت ﷺ ہمیں داغ مفارقت تو نہیں دینا چاہتے؟ اس بات کو سمجھو!!

یہ روایت اہل سنت کی کتابوں میں ہو یا اہل تشیع کی کتابوں میں بہر صورت قرآن کریم کی آیت کریمہ (ولا تخطه بيمينك اذا لارتاب المبطلون) یعنی آپ اپنے ہاتھ مبارک سے بھی اس کو نہ لکھنا تاکہ گمراہ کرنے والے لوگ شک پیدا نہ کر سکیں۔ (کہ حضور ﷺ خود لکھ سکتے تھے اور قرآن کریم بھی خود لکھا ہے خدا کی طرف سے نہیں) اب یہ نفی ہو یا نہی۔ بہر صورت آنحضرت ﷺ کا اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا ممنوع اور محال ہے اور روایت میں ہے کہ میں لکھوں۔ دوسرا بالفرض تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں۔ حضرت علی کی خلافت اور وہ بھی بلا فصل اس سے کیسے ثابت ہوگئی۔

تیسرا: اہل بیت کے مردوں میں حضرت علی موجود تھے تو ان کو دوات قلم پیش کرنے کا حکم ہوا۔ جیسا کہ "ایتونی" کا صیغہ جمع مذکر اسی امر پر دلالت کرتا ہے۔ فرض کرو کہ حضرت عمر نے حسبنا كتاب الله یعنی ہمیں قرآن کریم کافی ہے۔ فرمایا ہو۔ تو سوال یہ ہے کہ حضرت علی نے حضرت عمر کے کہنے پر عمل کرنا تھا رسول اللہ ﷺ کے حکم پر؟ پھر حضرت علی نے کس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے دوات و قلم و کاغذ پیش نہ کیا۔

چوتھا: فرض کریں حضور خلافت ہی لکھتے (جس کا ذکر تک روایت میں نہیں) مگر جب حضور ﷺ پہلے فرما رہے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر ہوگا۔ اس کے بعد عمر ہوگا رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے دیکھو تفسیر صافی جلد ۲ صفحہ ۳۲۰۔ اسی طرح تفسیر قمی اس آیت کریمہ کے تحت قال نبانی العلیم الخبیر ○ (پارہ ۲۸ سورہ تحریم) تفسیر امام حسن عسکری اور باقی تمام اہل تشیع کی معتبر ترین تفاسیر میں حضور اقدس ﷺ سے یہ روایت

ثابت ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمان کے خلاف اور اپنے ارشاد کے خلاف کوئی دوسری خلافت لکھنے لگے تھے۔

ہم پہلے حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واضح اور غیر مبہم خطبات آپ کو سنا چکے ہیں کہ حضرت علی سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلافت کی بیعت کرنے کے بارے میں کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میری خلافت کا زمانہ نہیں آیا۔ اس وقت میری خلافت کا سوال ایسا ہے جیسے کوئی قبل از وقت کچے میوے توڑے یا کسی دوسرے کی زمین میں کھیتی باڑی شروع کر دے۔ اور یہ کہ میرے ذمہ یہ ہے کہ میں دوسروں کی اطاعت کروں اور یہ کہ بیعت کرنے پر میرے لئے دوسروں کی اطاعت کا عہد و پیمان مقدم ہے میرے لئے ممکن ہی نہیں کہ ابوبکر کی بیعت کی مخالفت کروں۔ پھر ان کا خود بھی بیعت کرنا۔ یہ تمام تر روایات خلافت علی رضی اللہ عنہ کی تحریک کے منافی بلکہ مناقض ہیں۔

خم غدیر

اسی طرح یہ بھی ابلہ فریبی ہے کہ حضرت علی کی خلافت بلا فصل کی دلیل میں خم غدیر کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے متعلق فرمایا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" (یعنی جن کا میں دوست ہوں علی بھی ان کے دوست ہیں) ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں مولیٰ بمعنی دوست ہے۔ دیکھو آیت کریمہ "فان اللہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المومنین" (یعنی اللہ کے محبوب کا دوست اللہ جل شانہ ہے اور جبریل ہیں اور نیک بندے ہیں) "والملائکۃ بعد ذلک ظہیر" (اس کے بعد فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امداد کنندہ ہیں) (القرآن)۔

اب مولیٰ کا معنی حاکم یا امام یا امیر کرنا صراحۃً قرآن کریم کی مخالفت ہے اور تفسیر بالرائے ہے اور کون مسلمان یہ نہیں مانتا کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کے دوست ہیں۔ جن کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر میں ہجرت میں، غار میں، سفر میں، حتیٰ کہ قبر میں اپنا ساتھی اور رفیق منتخب فرمالیا۔ حضرت علی ان کے دوست ہیں۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا صاف صاف ارشاد گرامی نہ بھولئے جو حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں فرماتے ہیں کہ "ھما حبیبای" "یعنی وہ میرے دوست ہیں (یہ حوالہ گزر چکا ہے) علیٰ ہذا القیاس حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلا فصل پر غزوہ تبوک کی روایت کو دلیل بنانا سخت ناواقفی اور بے خبری کی دلیل ہے۔ یعنی غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حضرت علی کو ارشاد فرمانا "اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" "یعنی اے علی آپ اس بات پر راضی نہیں کہ جو نسبت ہارون کو موسیٰ سے تھی وہی منزلت آپ کو مجھ سے ہوتی۔ اب اس روایت سے ثابت کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بلا فصل فرما رہے ہیں کس قدر بے محل ہے۔ اولاً اس لئے کہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی عین حیات میں فوت ہو گئے تھے۔ اور حضرت موسیٰ کے خلیفہ نہ بلا فصل بنے اور نہ بالفصل۔ دیکھو شیعوں کے مجتہد اعظم ملا باقر مجلسی کی کتاب حیات القلوب صفحہ ۳۶۸ اور ناسخ التواریخ وغیرہ اور اولڈ ٹسٹامنٹ (بائبل) وغیرہ جہاں صراحۃً موجود ہے کہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی عین حیات میں فوت ہوئے اور یہود نے حضرت موسیٰ پر یہ اتہام لگایا کہ انہوں نے اس کو قتل کیا ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی برأت نازل فرمائی۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں ان کلمات طیبات کے ساتھ ہے۔ فبراہ اللہ مما قالوا وکان عنداللہ

وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ

نزهة القاری

شرح

صحیح البخاری مکمل

(پانچ حصے)



تصنیف

فقیہ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ



فرید بک سٹال

بنِ عَمْرٍو فَاِنَّهٗ کَانَ یَکْتُبُ وَلَا اَکْتُبُ عه

اس لئے کہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

(۸۳) حدیث قرطاس

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ جب نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرض سخت ہو گیا۔

تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهٗ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ اَکْتُبْ لَکُمْ کِتَابًا لَا تَضِلُّوْا

تو فرمایا لکھنے کا سامان لاؤ میں ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم لوگ گمراہ نہ ہو سکو۔

میں رہے تھے۔ جو اس زمانے میں علم حدیث کے شائقین کا مرجع اعظم تھا نیز حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انکا حافظہ اتنا قوی فرمادیا تھا کہ جو سنتے کبھی نہ بھولتے جیسا کہ ابھی آرہا ہے۔ اس لئے عبداللہ بن عمرو کے پاس لکھنے کے باوجود اتنا ذخیرہ نہ جمع ہو سکا جو ان کے حافظے میں موجود تھا۔ رہ گیا حضرت ابوہریرہ کا یہ فرمانا کہ وہ مجھ سے زیادہ حدیث والے ہیں یہ انھوں نے اپنے اندازے کے مطابق فرمایا۔ ان کا اندازہ یہی تھا۔ کہ میں صرف یاد رکھتا ہوں اور وہ لکھتے بھی ہیں۔ اور زبانی یاد بھی کرتے ہیں تو ان کے پاس زیادہ حدیثیں ہوں گی۔

حضرت ابوہریرہ نے یہ عہد نبوی کی بات کی ہے ورنہ بعد میں انھوں نے بھی حدیث لکھنا شروع کردیا تھا جس کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جیسا کہ فتح الباری میں ابن وہب کے حوالے سے ہے حسین ابن عمرو بن امیہ نے کہا حضرت ابوہریرہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور بہت سی کتابیں دکھائیں اور فرمایا دیکھو یہ میرے یہاں لکھی ہوئی رکھی ہیں۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں احادیث کا قلمبند کرنا شروع ہو چکا ہے اس کے علاوہ اور بھی طریقوں سے ثابت ہے اسکی تفصیل مقدمہ میں گذر چکی۔

تشریحات (۸۳)

تکمیل (۱) یہ حدیث اسکے علاوہ بخاری میں سات جگہ وارد ہے ان سب روایتوں کا ماحصل یہ ہے۔ کہ وصال سے چار دن قبل، جمعرات کو مرض میں بہت شدت ہوگئی اسی حالت میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حاضرین سے فرمایا کہ لکھنے کا سامان لاؤ۔ میں ایسی بات لکھوا دوں یا لکھ دوں جسکے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو۔ مرض کی شدت

عه ترمذی علم، مناقب، نسائی مناقب

بَعْدَہٗ قَالَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ إِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت عمر نے کہا کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بیماری کا غلبہ ہے۔

غَلَبَہُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا کِتَابُ اللّٰہِ حَسْبُنَا۔ فَاخْتَلَفُوْا وَکَثُرَ اللَّغَطُ قَالَ قُوْمُوْا

اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن) موجود ہے جو کافی ہے۔ اس پر حاضرین میں اختلاف ہوا اور باتیں بڑھیں۔ تو فرمایا

سے جو حال تھا اس کے پیش نظر حضرت عمر نے فرمایا اللہ کی کتاب ہمیں کافی ہے اس پر اختلاف ہوا کچھ لوگ کہتے تھے۔ کہ سامان کتابت لایا جائے اور کچھ لوگ کہتے تھے کہ نہیں کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کیا حضور نے ہمیں چھوڑ دیا۔ حضور سے پوچھو۔ آپس کی تکرار سے حضور کو تکلیف ہوئی اور فرمایا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ مسند امام احمد[1] میں ہے کہ یہ خطاب عام نہ تھا خاص حضرت علی سے فرمایا تھا کہ سامان کتابت لاؤ۔ ایک روایت دوسرے کی تفسیر ہوتی ہے۔ اس سے ثابت کہ ان روایات میں لفظ اگرچہ عام ہے مگر یہاں بھی مخاطب حضرت علی ہی ہیں۔

شبہات اور جوابات (۲) اس حدیث میں دو جگہ مقامات پر لفظ اھجر۔ استفھموہ کے ساتھ وارد ہے ھجر کے معنی برسامی کیفیت کے بھی ہیں۔ روافض نے زور باندھا ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں۔ کہ حاضرین نے کہہ دیا کہ حضور کو برسام ہو گیا۔ ہذیانی حالت ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اسے زبردستی حضرت عمر کے سر تھوپ دیا کہ انھوں نے یہ کہہ دیا۔ اس سلسلے میں جتنی روایتیں ہیں کسی میں حضرت عمر کی طرف یہ قول منسوب نہیں سب میں یہی ہے۔ قالوا۔ غور کرنے کی یہ بات ہے جو کچھ حضرت عمر نے کہا اسے قال عمر سے بیان کیا۔ اگر یہ بھی حضرت عمر کا مقولہ ہوتا تو کیا چیز مانع تھی کہ حضرت ابن عباس اسے جرأت کے ساتھ نہ بیان فرماتے کہ حضرت عمر نے یہ کہا حضرت عمر کے قول کو قال عمر سے اور اسے قالوا سے تعبیر کرکے یہ بتا دیا کہ یہ حضرت عمر کا قول نہیں تھا۔ دیگر حاضرین میں سے کسی نے یہ کہا تھا۔ روافض برسہا برس تک تلاش کر رہے ہیں کہ کہیں مل جائے کہ یہ عمر کا قول ہے مگر اب تک تو ملا نہیں آئندہ کیا ملے گا۔ رہ گیا یہ کہ یہاں ھجر کے معنی ہذیان کے ہیں یا چھوڑنے کے۔ اس کا فیصلہ۔ استفھموہ نے کر دیا۔ یعنی حضور سے پوچھو۔ جس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو اس سے پوچھنے کے کیا معنی؟ اس لئے یہاں متعین ہے کہ ھجر کے معنی چھوڑنے ہی کے ہیں یعنی جب حضور نے یہ فرمایا تو حاضرین نے یہ سمجھ لیا کہ یہ جدائی کی طرف اشارہ ہے ان پر قیامت ٹوٹ پڑی اور بیقراری میں کہنے لگے سرکار سے دریافت کرو کیا حضور نے ہمیں چھوڑ دیا۔ کہ ایسا ارشاد فرما رہے ہیں۔ مستقبل قریب میں جس کا ظہور متیقن ہوتا ہے۔ اسے ماضی سے تعبیر کرنا عام بات ہے۔ اس لئے ماضی کا صیغہ استعمال ہوا۔

---

[1] عینی ج ۲ ص ۱۷۱

رہ گئی یہ بات کہ حضور کے حکم تعمیل نہیں کی گئی اور بالخصوص حضرت عمر نے نہیں ہونے دی۔ اس پر گذارش یہ ہے کہ جب فاروق اعظم نے عرض کیا کتاب اللہ حسبنا اور حضور نے دوبارہ طلب نہیں فرمایا تو یہ دلیل ہے کہ حضرت عمر کی بات قبول ہوگئی اور اب وہ حکم باقی نہ رہا۔ ورنہ اولاً حضرت عمر کے اس عرض، کتاب اللہ حسبنا، کے بعد بھی اگر اس حکم کی تعمیل فرض تھی تو جب کہ یہ خطاب خاص حضرت علی سے تھا تو انھوں نے کیوں اس کی تعمیل نہیں کی۔ ثانیاً خود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دوبارہ کیوں نہیں فرمایا کہ نہیں پھر بھی لاؤ۔ ثالثاً اس وقت حضرت عمر کا بالفرض غلط خوف تھا تو اس کے بعد چار دن تک حضور حیات ظاہری کیساتھ رہے۔ حضرت عمر کے جانے کے بعد کیوں نہیں لکھوا دیا۔ رابعاً لازم آئے گا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرض تبلیغ کی ادائے گی میں کوتاہی کی بلکہ لازم آئے گا کہ پورا دین امت تک نہیں پہنچایا خامساً جبکہ پورا دین امت کو زبانی سکھا دیا تو کیا مانع درپیش تھا کہ اس اہم بات کو بھی زبانی ہی نہ فرمادیا۔ سادساً لازم آئے گا کہ دین ناقص رہ گیا۔ اور یہ آیت کریمہ، الیوم اکملت لکم دینکم کے معارض ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ یہ سب ہوائیاں صرف عداوت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اڑائی جارہی ہیں۔ ورنہ جو منصف بھی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مرتبے سے واقف ہے وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکار رسالت پناہی کے وزیر ہیں۔

مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا لَهُ وَزِيْرَانِ مِنْ أَهْلِ السَّمَاءِ وَوَزِيْرَانِ مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ ‎ فاما وزیرای من أَهْلِ السَّمَاءِ فَجِبْرَئِيْلُ وَمِيْكَائِيْلُ واما وزیرای من اهل الارض فابو بکر وعمر۔

ہر نبی کے دو وزیر آسمان والوں میں سے ہیں دو زمین والوں میں سے میرے آسمان والوں میں دو وزیر جبرئیل اور میکائیل ہیں اور زمین والوں میں ابوبکر و عمر۔

(ترمذی)

وزراء کو یہ حق ہے کہ اپنی رائے پیش کریں۔ یہاں بھی حضرت فاروق اعظم نے بحیثیت وزیر اپنی رائے عرض کر دی جسے حضور نے قبول فرمالی۔ بات ختم ہوگئی۔ اور یہ کوئی پہلا ہی موقع نہیں پچیس مواقع وہ ہیں جو کچھ فاروق اعظم نے عرض کیا اسی کے مطابق حکم الٰہی نازل ہوا ان میں بعض مواقع وہ بھی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فاروق اعظم کی رائے کے خلاف عمل فرمایا تو قرآن مجید نے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید فرمائی مثلاً بدر کے قیدیوں کے معاملے میں عتاب ہوا۔ فرمایا گیا۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ انفال آیت ۶۸

اگر اللہ پہلے سے ایک بات لکھ نہ چکا ہوتا تو اے مسلمانو تم نے کافروں سے فدیہ جو مال لیا اس پر بھاری عذاب آتا۔

عَنِّیْ وَلَا یَنْبَغِیْ عِنْدِیَ التَّنَازُعُ فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ یَقُوْلُ اِنَّ الرَّزِیَّۃَ

میرے پاس سے اٹھو میرے پاس جھگڑا مناسب نہیں۔ یہ حدیث روایت کرنے کے بعد ابن عباس یہ کہتے

کُلَّ الرَّزِیَّۃِ مَا حَالَ بَیْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَبَیْنَ کِتَابِہٖ

ہوئے نکلے بیشک مصیبت ہے اور پوری مصیبت جو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کی اس تحریر کے درمیان حائل ہوگئی۔

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لو نزل عذاب ما نجا منا الا عمر بن خطاب وسعد بن معاذ۔ — اگر بالفرض عذاب اترتا تو عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ کے علاوہ کوئی نہ بچتا۔

ایسے صائب الرائے اور معتمد وزیر نے کوئی بات عرض کی اور وہ قبول ہوگئی تو اب وزیر پر اعتراض اصل میں سلطان پر اعتراض ہے۔

اس بحث کے بعد اس گفتگو کی بھی حاجت باقی نہ رہی کہ حضور کیا لکھوانا چاہتے تھے۔ اور اگر کسی کو اس کا شوق ہی ہے تو چلئے روافض کہتے ہیں حضرت علی کے خلیفہ بلا فصل کی سند لکھوانا چاہتے تھے۔ ہم کہیں گے حضرت صدیق اکبر کے لئے یہی سند لکھنی چاہئے تھی۔ حضرت علی کے سلسلے میں کوئی سراغ نہیں مگر صدیق اکبر کے لئے تو ثبوت ہے۔ کہ ارشاد فرمایا۔

ادعی لی ابا بکر اباک واخاک حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول قائل انا اولی ویابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر — ابو بکر اپنے والد اور اپنے بھائی کو بلاؤ کہ میں ان کے لئے لکھ دوں مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی آرزو کرنے والا آرزو کرے اور کہے میں سب سے زیادہ مستحق ہوں حالانکہ اللہ اور مومنین سوائے ابو بکر کے کسی پر راضی نہیں۔

مسلم ج ۲ ص ۲۷۳

یہی مضمون بخاری میں یوں ہے میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ابو بکر اور ان کے بیٹے کو بلا کر ولی عہد بنا دوں۔ کہ کہیں کہنے والے کہیں نہ اور آرزو کرنے والے آرزو نہ کریں۔ حالانکہ اللہ اور مومنین ابو بکر کے سوا کسی کو ان کے ہوتے ہوئے پسند نہ کریں گے۔ پھر ہو سکنے میں بڑی گنجائش ہے ہم کہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ حضور یہی لکھوانا چاہتے تھے۔ کہ کتاب اللہ کو کافی سمجھنا۔ اور جب فاروق اعظم نے یہی عرض کر دیا تو ضرورت محسوس نہ فرمائی۔ اسی حدیث کے اخیر کتاب الجہاد وغیرہ میں ہے۔

علہ ایضا بخاری جہاد، جوائز الوفود۔ واخراج الیہود من جزیرۃ العرب، مغازی، مرض النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو طریقے سے۔ مرضی، قوموا عنی میں دو طریقے سے، اعتصام، کراہیۃ الاختلاف میں ایک طریقے سے۔ مسلم وصایا۔ نسائی علم وطب۔

(۸۲) حدیث، رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ اِسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ایک رات نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ. فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ

بیدار ہوئے تو فرمایا سبحان اللہ اس رات میں کتنے فتنے نازل ہوئے ہیں۔

اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفود مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دینا اور وفود کو اسی طرح بنحو ماکنت اجیزھم۔ صلہ دینا جیسے میں دیتا تھا۔

اور تیسری بات کسی راوی کے ذہن سے نکل گئی۔

ہوسکتاہے یہی تینوں باتیں لکھوانی چاہتے تھے جب سامان کتابت نہیں آیا تو زبانی ارشاد فرمایا۔

سلامت روی اسی میں ہے کہ ہوسکتا کے سہارے بات نہ بڑھائی جائے

اس حدیث سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنا خلیفہ بلا فصل بنانے کی وصیت تو بہت دور ہے خلیفہ بنانے کی بھی کوئی وصیت نہ لکھی تھی نہ کی تھی۔

رہ گیا حضرت ابن عباس کا یہ کہنا کہ بڑی مصیبت ہے۔ ان کا ذاتی جذباتی تاثر ہے ان سے علم وفہم اور دیانت میں حضرت عمر وحضرت علی بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں۔ ان حضرات کے مقابلے میں ابن عباس کی بات بالاتفاق مرجوح ہے۔

تشریحات (۸۲)

ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (۱) یہ ازواج مطہرات میں سے ہیں۔ ان کا نام رملہ تھا۔ یہ پہلے ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ یہ دونوں قدیم الاسلام ہیں۔ ابوسلمہ کے ساتھ حبشہ کی دونوں ہجرتیں کیں۔ پھر مدینہ ہجرت کی۔ مدینے میں ان دونوں کی چار اولاد ہوئیں۔ زینب، سلمہ، عمر، درہ۔ ابوسلمہ کے وصال کے بعد ان سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شوال ۴ھ میں عقد فرمایا۔ یزید کے تغلب تک زندہ رہیں۔ ان کو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کربلا کی خاک دی تھی جو حضرت امام حسین کی شہادت کے وقت سرخ ہوگئی اسی سے انھوں نے جانا کہ حضرت امام حسین شہید ہوگئے۔ وصال کے وقت عمر مبارک چوراسی سال کی تھی حضرت ابوہریرہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ ان سے تین سو اٹھتر حدیثیں مروی ہیں جن میں تیرہ متفق علیہ ہیں۔

اہل سنت اور روافض کے مابین دو متنازعہ مسائل پر مفصل فتوے

باغِ فدک

مع

حدیثِ قرطاس

مفتی جلال الدین احمد امجدی

تحریک فکر رضا ایوانڈ

فتویٰ متعلق حدیث قرطاس

مسئلہ

از

محمد قمر الدین قادری چشتی، ڈاک خانہ منڈی، ضلع پونچھ (جموں کشمیر)

کیا فرماتے ہیں علمائے ملت اسلامیہ اس مسئلہ میں کہ رافضی لوگ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے درد کی شدت میں صحابہ سے فرمایا کہ قلم دوات لاؤ، تاکہ میں تم لوگوں کے لئے ایک تحریر لکھ دوں، جس سے تم لوگ کبھی گمراہ نہ ہو، تو حضرت عمر نے کہا کہ اس وقت حضور کو درد کی شدت ہے، وہ ہذیان بول رہے ہیں، لکھنے کا سامان لانے کی ضرورت نہیں، تمہارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ اس بات پر جب صحابہ نے قلم دوات لانے میں اختلاف کیا اور لوگوں کی گفتگو سے شور و غل ہوا تو حضور نے سب کو اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ اس واقعہ سے چار اعتراض پیدا ہوتے ہیں:

۱- اول یہ کہ حضرت عمر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو رد کر دیا، حالانکہ حضور کا قول وحی ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: و ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحٰی۔ اور وحی کا رد کرنا کفر ہے۔

۲- دوسرے یہ کہ حضور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہذیان کی نسبت کی یعنی بہکی بہکی باتیں کرنا، اس میں حضور کی توہین ہوئی، اس لئے کہ نبی کو کبھی جنون نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی وہ بہکی بہکی باتیں کر سکتا ہے۔

۳- تیسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لوگوں نے شوروغل کیا اور چلائے، جبکہ قرآن حکیم میں ہے کہ جو پیغمبر کی آواز سے اپنی آواز اونچی کرے گا اس کی سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔

۴- چوتھے یہ کہ لکھنے کا سامان نہ دینے سے مسلمانوں کی حق تلفی ہوئی، اگر حضور تحریر فرما دیتے تو مسلمان گمراہی سے محفوظ ہو جاتے۔

ان اعتراضوں کے مدلل اور مفصل جواب تحریر فرمائیں، کرم ہوگا!



الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔
جوابات لکھنے سے پہلے ہم اس واقعہ سے متعلق دو روایتیں درج کرتے ہیں، تاکہ اصل واقعہ معلوم ہو جانے کے بعد جوابات کے سمجھنے میں آسانی ہو:

پہلی روایت

عن سعید بن جبیر، قال: قال ابن عباس: یوم الخمیس اشتد برسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم وجعہ، فقال: ایتونی بکتف اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ ابدا فتنازعوا و لا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا ما شانہ اھجر استفھموہ فذھبوا یردون علیہ، فقال: دعونی ذرونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ فامرھم بثلث فقال: اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب و اجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم و سکت عن الثالثۃ۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جمعرات کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درد زیادہ ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس شانہ کی ہڈی لاؤ، میں تمہارے

لئے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ اس کے بعد تم لوگ کبھی نہ بھکو! تو لوگوں نے آپس میں اختلاف کیا اور نبی کے پاس اختلاف مناسب نہیں۔ تو کئی لوگوں نے کہا کہ حضور کا کیا حال ہے؟ کیا جدائی کا وقت قریب آ گیا ہے؟ آپ سے دریافت کرلو! بعض صحابہ نے لکھنے کے بارے میں آپ سے دریافت کرنا شروع کیا، تو جواب میں آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اس لئے کہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے کہ جس کی طرف تم لوگ مجھے بلا رہے ہو۔ اور آپ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی: اول مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو! دوم ایلچیوں کو انعام دو جیسا کہ میں دیتا تھا، یہ کہہ کر تیسری وصیت سے خاموش ہو گئے یا راوی نے کہا کہ میں اس کو بھول گیا۔ (بخاری، مسلم)

دوسری روایت

عن ابن عباس، قال: لما حضر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم و فی البیت رجال فیھم عمر بن الخطاب، قال النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم: ھلموا اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ، فقال عمر: قد غلب علیہ الوجع و عندکم القرآن حسبکم کتاب اللّٰہ فاختلف اھل البیت و اختصموا من یقول قربوا یکتب لکم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم و منھم من یقول ما قال عمر فلما اکثروا اللغط و الاختلاف، قال رسول اللّٰہ: قوموا عنی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ جب حضور کے وصال کا وقت قریب آیا تو حجرۂ مبارکہ میں بہت سے لوگ موجود

تھے، جن میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ میں تم لوگوں کے لئے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ اس کے بعد تم نہ بہکو، تو حضرت عمر نے کہا کہ اس وقت حضور کو بیماری کی تکلیف زیادہ ہے، تمہارے پاس قرآن ہے، وہی اللہ کی کتاب تمہارے لئے کافی ہے، تو حجرہ میں جو لوگ موجود تھے انہوں نے اختلاف کیا، بعض لوگ کہتے تھے کہ حضور کے پاس لکھنے کا سامان رکھ دو تا کہ وہ تمہارے لئے تحریر لکھ دیں، اور بعض لوگ وہی کہتے تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، جب لوگوں نے باتیں بڑھادیں اور اختلاف زیادہ پیدا ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ میرے پاس سے اٹھ جاؤ! (بخاری ومسلم)

اجمالی جواب

حدیث شریف سے اصل واقعہ کی تفصیل کے بعد اجمالی جواب یہ ہے کہ یہ کام صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا، بلکہ دوسرے صحابہ بھی اس میں شریک ہیں، اس لئے کہ جتنے صحابہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارکہ میں موجود تھے اس معاملہ میں وہ لوگ دو گروہ ہو گئے تھے اور حضرت عباس وحضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے، تو اگر یہ دونوں حضرات لکھنے کا سامان نہ لانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کئے تو یہ سارے الزامات ان دونوں حضرت پر بھی عائد ہوتے ہیں اور اگر یہ لوگ لکھنے کا سامان لانے کی تائید میں تھے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کئے تو اس صورت میں حضور کی بارگاہ میں آواز بلند کرنے اور روکنے والوں کے سبب رک جانے یعنی لکھنے کا سامان حاضر نہ کرنے کا الزام ان دونوں حضرات پر بھی عائد ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے لکھنے کا سامان کیوں نہ پیش کر دیا۔ اور پھر یہ واقعہ جمعرات کا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال دوشنبہ مبارکہ (پیر) کو ہوا، تو فرصت کا موقع بہت تھا۔ حضرت ابن عباس وحضرت علی رضی اللہ عنہما

نے اس درمیان میں حضور سے کیوں نہ لکھالیا، اور پھر حضور ﷺ کا حکم ان لفظوں کے ساتھ تھا:

ایتونی بقرطاس۔
یعنی تم لوگ میرے پاس کاغذ لاؤ!

تو یہ حکم سب حاضرین سے تھا نہ کہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے، لہٰذا اگر حضور ﷺ کا یہ حکم فرض یا واجب مانا جائے تو حاضرین میں سے ہر ایک کو گنہ گار تسلیم کرنا پڑے گا، اور اگر فرض و واجب نہ مانا جائے تو ان میں سے کسی پر الزام عائد نہیں ہوتا اور یہی حق ہے۔

رافضیوں کے سارے اعتراضات باطل و غلط ہیں، ہر ایک کے تفصیلی جوابات نمبر وار درج ذیل ہیں:

۱۔حضور ﷺ کے قول کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں رد کیا

یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے قول کو رد کر دیا، اس لئے کہ انہوں نے درد کی شدت میں حضور کے آرام و راحت کا خیال کیا کہ حضور محنت و مشقت میں نہ پڑیں، اور اسے رد نہیں کہتے، ہر شخص اپنے عزیز بیمار کو محنت و مشقت میں پڑنے سے بچاتا ہے، خاص کر بزرگ اگر کسی وقت شدت مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور حاضرین کے فائدہ کے لیے خود ہی کچھ اٹھانا چاہتا ہے تو کوئی بھی اسے گوارا نہیں کرتا، یہی سب لوگوں میں معمول ہے۔ لہٰذا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضور ﷺ امت کے فائدے کے لیے مشقت میں پڑنا چاہتے ہیں کہ خود لکھیں یا لکھائیں، بہر حال مضمون بتانا یا خود لکھنا شدت مرض میں تکلیف کا سبب ہوگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے از راہ محبت گوارا نہ کیا اور بلحاظ ادب حضور کو خطاب نہ کیا بلکہ اور لوگوں کو کتاب اللہ کے اشارہ سے ثابت کیا کہ حضور کو مشقت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں، تاکہ حضور کے کان

مبارک تک یہ آواز پہنچے اور آپ جان لیں کہ شدت مرض میں ایسی مشقت اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اور اس معاملہ میں عقلمندوں کے نزدیک حقیقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باریک بینی ہے جو لائق صد تعریف ہے کہ تقریباً تین ماہ پہلے یہ آیہ کریمہ نازل ہو چکی تھی:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

آج کے دن میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر تمام کر دیا۔ (پارہ ۶، ع ۵)

تو اس آیہ کریمہ نے نسخ و تبدیل اور دین کے احکام میں کمی بیشی کے دروازے کو بالکل بند کر کے اس پر مہر لگا دی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی اسی آیت کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

حسبکم کتاب اللّٰہ۔

یعنی اللہ کی کتاب تم کو کافی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں کوئی ایسی نئی بات لکھانے والے ہیں جو پہلے سے کتاب و شریعت میں نہیں آئی ہے تو آیہ کریمہ **الیوم اکملت لکم دینکم** کا جھٹلانا لازم آتا ہے اور یہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محال ہے، لہٰذا حضور کا مقصد یہ ہے کہ ان احکام کی تاکید فرمائیں جو پہلے مقرر فرما چکے ہیں تو شدت مرض میں حضور کو مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں، بہتر ہے کہ وہ آرام فرمائیں، ہم کو خدائے تعالیٰ کی کتاب اور اس کی تاکید کافی ہے۔ اور اس بات پر حدیث شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ گواہ ہے کہ

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قد غلب علیہ الوجع و عندکم القران حسبکم کتاب اللّٰہ۔

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے،
وہی اللہ کی کتاب تم کو کافی ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوںؓ نے حضور کی بات رد کردی، انتہائی نادانی و جہالت اور بغض و عداوت ہے کہ اس قسم کی مصلحت آمیز باتیں اور مشورے حضور و صحابہ کے درمیان اکثر ہوا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس خصوص میں سب سے زیادہ ممتاز تھے کہ منافقوں پر نماز پڑھنے، ازواجِ مطہرات کو پردہ نشین کرنے، جنگ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے، مقام ابراہیم کو مصلّٰی ٹھہرانے اور بشر منافق کے قتل وغیرہ بہت سے معاملات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عرض و مشورے کے مطابق وحی نازل ہوئی اور اکثر واقعات میں ان کی بات اللہ و رسول کی بارگاہ میں مقبول ہوئی، اور اگر اس قسم کی مصلحت آمیز باتوں کے پیش کرنے کو حضور کی بات کا رد کرنا یا وحی کا ٹھکرانا قرار دیا جائے، جیسا کہ رافضی لوگ کرتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی کئی معاملہ میں حضور کی بات کا رد کرنا یا وحی کے ٹھکرانے کا الزام عائد ہو جائے گا:

اول یہ کہ بخاری شریف میں متعدد طریقے سے مروی ہے کہ سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی و حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان پر رات کے وقت تشریف لے گئے، ان کو خواب گاہ سے اٹھایا اور نماز تہجد ادا کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

قوما فصليا۔

یعنی تم دونوں اٹھ کر نماز پڑھو!

اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

واللّٰہ لا نصلی الا ما کتب اللّٰہ لنا۔

یعنی خدا کی قسم ہم فرض نماز سے زیادہ نہیں پڑھیں گے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر سے واپس ہو گئے اور فرمایا:

وكان الانسان اكثر شيء جدلا۔

اور آدمی ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ (پارہ ۱۵ ع ۲۰)

کیا اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وحی کا ٹھکرانے والا کہا جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ان کی ملامت نہ فرمائی۔

دوسرے یہ کہ صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو صلح نامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کافروں کے درمیان لکھا جارہا تھا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور کے نام کے ساتھ لفظ "رسول اللہ" لکھا، تو مشرکین مکہ نے اس لفظ کے لکھنے پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہم اگر رسول اللہ مانتے تو پھر آپ سے کیوں لڑتے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا:

امح رسول الله۔

یعنی رسول اللہ کا لفظ مٹادو!

تو حضرت علی نے کہا: قسم خدا کی ہم ہرگز نہیں مٹائیں گے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ ان کے ہاتھ سے لے کر خود مٹایا۔

کیا اس واقعہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور کی بات رد کرنے والا اور وحی کا ٹھکرانے والا قرار دیا جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ حد درجہ ان کو حضور سے محبت کرنے والا قرار دیا جائے گا، تو پھر از راہ محبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ درد کی شدت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشقت میں پڑنا گوارا نہ فرمایا، تو ان کو وحی کا ٹھکرانے والا کیوں قرار دیا جائے گا؟

اگر رافضی ایسی باتوں کو بھی پیغمبر کے قول کا رد کرنا اور وحی کا ٹھکرانا کہیں گے تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے، اس لئے کہ رافضی کی معتبر کتابوں میں بھی اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل

نہیں کیا، جیسا کہ شریف مرتضیٰ نے جس کا لقب امامیہ کے نزدیک ''علم الھدیٰ'' ہے، اپنی کتاب ''درر غرر'' میں محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور انہوں نے اپنے باپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی، انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ماں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی تہمت کے بارے میں لوگوں نے بہت باتیں کیں، اس لئے کہ ان کا چچازاد بھائی ان سے کبھی کبھی ملنے کے لئے آیا کرتا تھا تو حضور نے حضرت علی سے فرمایا:

خذ هذا السيف و انطلق فان وجدت عندها فاقتله۔

یعنی اس تلوار کو لے کر جاؤ اور ماریہ کے پاس اگر اس مرد کو پاؤ تو قتل کر دو!

حضرت علی فرماتے ہیں کہ میں حضور کے حکم کے مطابق اس مرد کی طرف متوجہ ہوا، تو اس نے جان لیا کہ میں اس کا قصد رکھتا ہوں تو وہ میرے پاس آ کر کھجور کے درخت پر چڑھتے ہوئے اپنے آپ کو پیٹھ کے بل گرا دیا اور دونوں پاؤں کو اٹھا دیا، تو میں نے دیکھا کہ وہ مجبوب ہے یعنی مقطوع الذکر و الخصیتین ہے، اس کے پاس مردوں کے جیسا کچھ نہیں ہے، تو میں نے اپنی تلوار میان میں کر لی اور واپس آ کر حضور سے اس کا سارا حال بیان کیا، تو حضور نے فرمایا:

الحمد لله الذى يصرف عنا الرجس اهل البيت۔

خدائے پاک کا شکر ہے کہ وہ ہمارے جملہ اہل بیت کو گندگی سے بچاتا ہے۔

اور محمد بن بابویہ نے امالی میں و دیلمی نے ''ارشاد القلوب'' میں روایت کی ہے:

ان رسول الله صلى الله عليه و سلم اعطى فاطمة سبعة دراهم و قال: اعطيها عليا و مريه ان يشترى لاهل بيته طعاما فقد غلبهم الجوع فاعطتها عليا و قالت ان رسول الله

صلی اللہ علیہ و سلم امرك ان تبتاع لنا طعاما فاخذها علی و خرج من بیته لیبتاع طعاما لاهل بیته فسمع رجلا یقول: من یقرض الملی الوفی فاعطاه الدراهم۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو سات درہم عطا فرمایا کہ اور حکم دیا کہ یہ درہم علی کو دے کر کہہ دو کہ وہ اپنے اہل بیت کے واسطے کھانا خرید لائیں کہ ان پر بھوک غالب ہو رہی ہے، تو حضرت فاطمہ نے وہ درم علی کو دیا اور کہا: بے شک حضور نے حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے واسطے کھانا خرید لائیں، تو حضرت علی وہ درم لے کر اپنے اہل بیت کے واسطے کھانا خریدنے کے لئے گھر سے نکلے، راستہ میں سنا، ایک شخص کہتا ہے کہ کون ایسا آدمی ہے جو سچے وعدہ پر ہم کو قرض دے؟ تو حضرت علی نے وہ درم اس کو دے دیے۔

اس واقعہ میں حضور کے حکم کی مخالفت بھی ہے اور غیر کے مال میں بلا اجازت تصرف بھی اور اپنے اہل و عیال کے حق کا تلف کرنا بھی اور حضور کی اولاد کو بھوکا رکھ کر ان کو تکلیف پہنچانا بھی، مگر یہ سب انہوں نے اللہ واسطے کیا اور ایثار کیا جو قابل تعریف و تحسین ہے، حضور کے حکم کا رد کرنا اور وحی کا ٹھکرانا نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خوب جانتے تھے کہ ہمارے اس فعل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہ زہرا اور حسنین بھی راضی ہوں گے رضی اللہ عنہم۔

ان تمام واقعات سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی الٰہی نہیں ہے، ورنہ لفظ رسول اللہ کے مٹانے، قبطی مرد کے قتل کرنے، کھانا خریدنے اور تہجد کی نماز پڑھنے کا حکم سب وحی الٰہی ہوتا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر وحی الٰہی کے ٹھکرانے کا الزام عائد ہوتا۔

اور جنگ تبوک کے موقع پر جبکہ حضور نے حضرت علی کو اہل و عیال میں رہنے کا حکم دیا تو ان کا یہ کہنا ہرگز نہ ہوتا:

اتخلفنی فی النساء و الصبیان۔

یعنی کیا آپ ہم کو عورتوں اور بچوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔

بلکہ ہم یہاں تک کہتے ہیں کہ رافضی سنی دونوں کے نزدیک حکم الٰہی کے خلاف مصلحت کو پیش کرنا اور مشقت کو ٹالنے کے لئے بار بار اصرار کرنا بھی وحی الٰہی کو ٹھکرانا نہیں، جیسا کہ سرکار اقدس ﷺ شب معراج حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے نو بار خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹ لوٹ کر گئے اور عرض کیا: یا الٰہ العالمین! میری امت اتنی نمازوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے گی۔ اگر۔ معاذ اللہ رب العالمین۔ یہ وحی کا رد کرنا اور ٹھکرانا ہوتا تو سید الانبیا سرکار مصطفیٰ ﷺ سے اس کا صدور ہرگز نہ ہوتا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسا مشورہ دیتے۔

اور قرآن مجید سورۂ شعرا میں ہے:

و اذ نادی ربك موسٰی ان ائت القوم الظالمین قوم فرعون الا یتقون قال رب انی اخاف ان یکذبون و یضیق صدری و لا ینطلق لسانی فارسل الٰی هارون و لهم علی ذنب فاخاف ان یقتلون قال کلا فاذهبا باٰیاتنا انا معکم مستمعون۔

(پارہ ۱۹ ع ۶)

اور یاد کرو! جب تمہارے رب نے موسیٰ کو ندا فرمائی کہ ظالم لوگوں کے پاس جاؤ جو فرعون کی قوم ہے، کیا وہ نہیں ڈریں گے؟ عرض کیا: اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اور میرا سینہ تنگی کرتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی، لہٰذا تو ہارون کو بھی رسول کر اور اس قوم کا مجھ

پر ایک الزام ہے، تو میں ڈرتا ہوں کہیں مجھ کو قتل کر دیں۔ فرمایا: یوں نہیں، تم دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ، بے شک ہم تمہارے ساتھ سننے والے ہیں۔

ان آیات مبارکہ سے بھی واضح ہو گیا کہ خدائے تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں مصلحت کو پیش کرنا وحی الٰہی کا رد نہیں ہے، ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں ہرگز اس کے مرتکب نہ ہوتے۔

اور پھر رافضی، سنی دونوں کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ اللہ و رسول کا ہر حکم وجوب کا مقتضی نہیں ہوتا بلکہ مستحب ہونے کا بھی احتمال رکھتا ہے، جیسا کہ سنیوں کی کتاب ''نور الانوار'' اور رافضیوں کی کتاب ''درر غرر'' میں مذکور ہے۔ لہٰذا جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض حکم کو مستحب سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا اور موردِ الزام نہ ہوئے اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضور کے حکم کو مستحب ٹھہرا کر درد کی شدت میں آپ کو مشقت میں ڈالنا ضروری نہ سمجھا تو وہ بھی موردِ الزام نہ ہوئے۔ و ھو تعالیٰ اعلم۔

۲۔ حضور کی طرف حضرت عمر نے ہذیان کی نسبت نہیں کی

صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہ

اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہذیان کی نسبت کی ہے۔ اس لئے کہ حدیث شریف کا یہ جملہ اھجر استفھموہ (کیا حضور نے پریشان بات کہی ان سے پوچھو!) حضرت عمر ہی نے کہا' یقین کے ساتھ ہرگز ثابت نہیں کہ بخاری و مسلم وغیرہ کی اکثر روایتوں میں یوں ہے:

قالوا ما شانہ اھجر استفھموہ۔

لوگوں نے کہا: حضور کا کیا حال ہے، کیا انہوں نے پریشان بات کہی، ان سے پھر پوچھو۔

مطلب یہ ہے کہ ہجر کے معنی پریشان وہذیان اور بے ہودہ بکنے کے بھی ہیں، یہ تو تسلیم ہے، مگر ہوسکتا ہے کہ کلام میں استفہام انکاری ہو، جیسے پارہ اول رکوع دوم میں ہے کہ منافقوں نے کہا:

انؤمن کما امن السفهاء؟

یعنی کیا ہم ایمان لائیں جیسے کہ بے وقوف لوگ ایمان لائے؟ یعنی ہم ایمان نہیں لائیں گے۔

تو اسی طرح جو لوگ لکھنے کا سامان لانے کی تائید میں تھے ہوسکتا ہے انہی لوگوں نے کہا ہو: اھجر استفھموہ. کیا حضور نے ہجر کیا یعنی ہذیان نہیں کیا ہے لکھنے کا سامان لانا چاہیے ان سے پھر پوچھو!

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ لکھنے کا سامان لانے کے مخالف تھے انہی لوگوں نے استفہام انکاری کے طور پر کہا ہو: اھجر استفھموہ یعنی حضور کو ہذیان تو ہوا نہیں، اس لئے کہ نبی اس سے محفوظ ہوتے ہیں، تو آپ کا کلام ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کون سی ایسی ضروری چیز ہے جسے حضور شدت درد میں لکھنا چاہتے ہیں، پھر سے پوچھو۔

اور نہ سمجھنے کی وجہ بالکل ظاہر تھی اس لئے کہ حضور ﷺ کی عادت کریمہ تھی کہ احکام کو خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب فرماتے تھے اور اس موقع پر یہ نہیں فرمایا کہ ان اللّٰہ امرنی ان اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدی۔ بے شک اللہ نے مجھ کو فرمایا ہے کہ میں تم لوگوں کے لئے ایک کتاب لکھ دوں تاکہ تم گمراہ نہ ہو۔

لہٰذا جو لوگ لکھنے کا سامان نہ لانے کی تائید میں تھے ان کو شبہ پیدا ہوا کہ حضور نے تو عادت کے مطابق ہی فرمایا ہوگا، مگر ہم نہیں سمجھے، پھر سے پوچھو۔

اور صحابہ کرام خوب جانتے تھے کہ حضور ﷺ دفع تہمت کے لئے کبھی لکھتے نہ

تھے۔ قرآن مجید پارہ ۲۱ رکوع ۱ میں ہے:

و ما کنت تتلو من قبله من کتاب و لا تخطه بیمینك۔

اس سے پہلے تم کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔

مگر اس موقع پر حضور نے خود لکھنے کو فرمایا، اس لئے صحابہ کو دوبارہ سمجھنے کی ضرورت پیش آئی۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ هَجَرَ هَجْرٌ و هجران سے مشتق ہو، جس کے معنی چھوڑنے کے ہیں اور لفظ الحیاۃ مفعول مقدر ہو، تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کیا حضور نے ظاہری زندگی چھوڑ دی؟ معلوم کرو! جیسا کہ قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد جگہ چھوڑنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً پارہ ۱۶ رکوع ۶ میں ہے:

و اهجرنی ملیا۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا آزر نے ان سے کہا کہ تم مجھے زمانہ دراز تک چھوڑ دو!

اور سورہ مزمل میں ہے:

و اهجرهم هجرا جمیلا۔

یعنی انہیں اچھی طرح چھوڑ دو۔

اور بعض روایتوں میں جو ہمزۂ استفہام نہیں ہے تو مقدر ہے، جیسے پارہ ۷ ع ۱۵ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول: هذا ربی کے شروع میں بہت سے مفسرین کے نزدیک ہمزۂ استفہام مقدر ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بخاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

اگر در بعضے روایات حرف استفہام مذکور نباشد مقدر است۔

اگر بعض روایتوں میں حرف استفہام مذکور نہیں ہے تو مقدر ہے۔

(اشعۃ اللمعات جلد ۳ ص ۶۱۰)

اور اگر ہجر کے معنی اختلاطِ کلام ہی کے لئے جائیں تو اس کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ اختلاط جو بالاتفاق انبیائے کرام کو ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قوت گویائی کے اعضا کمزور ہو جائیں یا آواز بیٹھ جائے یا زبان پر خشکی کا غلبہ ہو جن کے سبب الفاظ اچھی طرح سننے میں نہ آئیں، تو یہ حالتیں انبیا کو لاحق ہو سکتی ہیں، جیسا کہ حدیث شریف کی صحیح کتابوں میں موجود ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری بیماری میں آواز بیٹھنے کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔

اور اختلاطِ کلام کی دوسری قسم کا عارضہ غشی کے سبب یا دماغ پر بخارات کے چڑھ جانے سے تحت بخار میں ہوتا ہے کہ اکثر اس حالت میں مقصد کے خلاف کلام زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

اختلاط کلام کی یہ قسم انبیا کو ہو سکتی ہے یا نہیں؟ علما کو اس میں اختلاف ہے، جو لوگ اسے جنون کی قسم قرار دیتے ہیں وہ انبیائے کرام کے لیے اسے جائز نہیں ٹھہراتے۔ اور بعض لوگ اسے غشی و بے ہوشی کے مثل قرار دیتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس طرح کا عارضہ لاحق ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے، جیسا کہ پارہ ۹ رکوع ۷ میں ہے:

و خر موسٰی صعقا۔

یعنی موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اور پارہ ۲۴ ع ۲ میں ہے:

و نفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت و من فی الارض الا من شاء اللّٰہ ثم نفخ فیہ اخرٰی فاذا ھم قیام ینظرون۔

اور صور پھونکا جائے گا تو جسے اللہ چاہے گا اس کے علاوہ جتنے زمین جو آسمان میں ہیں سب بے ہوش ہو جائیں گے پھر صور دوبارہ پھونکا جائے

گا تو وہ سب دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے۔

اور صحیح حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

فاکون اول من یفیق فاذا موسیٰ اخذ بقائمة من قوائم العرش۔

تو پہلے جس کو ہوش ہوگا وہ میں ہوں گا اور موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ وہ عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے ہوئے ہیں۔

ثابت ہوا کہ انبیائے کرام پر غشی و بے ہوشی طاری ہوتی ہے اور یہ ان کی شان کے خلاف نہیں۔ اور خوب ظاہر ہے کہ اس حالت کو جنون پر قیاس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جنون میں پہلے قوائے مدرکہ کی روح میں خلل واقع ہوتا ہے اور ہمیشہ رہتا ہے، لیکن اس حالت میں روح کے اندر ہرگز خلل نہیں ہوتا، بلکہ کچھ وقت کے لئے جسم کے صرف اعضا مرض کے سبب قابو میں نہیں رہتے، مگر خدائے تعالیٰ اپنے انبیائے کرام کو اس حالت میں بھی اپنی مرضی کے خلاف کچھ کرنے اور کہنے سے بچائے رکھتا ہے۔

لہٰذا اگر بعض حاضرین کو وہم پیدا ہو کہ حضور کا حکم اختلاط کلام کی قسم سے ہے جو ایسے مرضوں میں ظاہر ہوتا ہے تو کچھ بعید بھی نہیں کہ درد سر کی شدت کے ساتھ اس وقت حضور پر بخار بھی بہت زور کیے ہوئے تھا، مگر اس کے باوجود کہنے والے نے بلحاظ ادب قطعی طور پر بات نہ کہی، بلکہ بطریق تردد کہا: **ما شانه اهجر استفهموه.** یعنی ان کا کیا حال ہے، کیا اختلاط کلام ہوا ہے یا ہم سمجھے نہیں، دوبارہ پوچھو! واضح فرمائیں اگر حکم ہو لکھنے کا سامان لائیں ورنہ جانے دیں کہ درد کی شدت میں مشقت اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اور یہ سب باتیں اس صورت پر ہیں جبکہ اختلاط کلام سے آخری قسم مراد ہو اور اگر قسم اول مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اس مضمون کو ہم حضور کی عادت کے خلاف دیکھتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ آپ کی قوت گویائی میں کمزوری پیدا ہو گئی ہو اس سبب سے ہم آپ

کے کلام کو بخوبی نہیں سمجھ سکے، لہٰذا دوبارہ پوچھوتا کہ ظاہر فرمائیں اور ہم یقین کے ساتھ جان لیں کہ حضور لکھنے کا سامان طلب فرما رہے ہیں تو ہم اسے حاضر کریں۔ اور اس صورت میں بھی کسی پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ و ہو سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

۴۔ حضور کی آواز پر کسی نے آواز اونچی نہیں کی

بے شک سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز کو اونچی کرنا سب نیکیوں کو برباد کرنا ہے اور حضور کی آواز پر آواز کو بلند کرنا سخت گناہ ہے۔ مگر اس واقعہ میں کسی نے ایسا نہیں کیا اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور نہ کسی دوسرے صحابی نے۔ البتہ آپس کی گفتگو میں حضور کے سامنے ان لوگوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ صحابہ کرام آپس کی بحثوں اور جھگڑوں میں حضور کے سامنے ایک دوسرے پر آوازیں بلند کرتے تھے، نعرے لگاتے تھے اور حضور منع نہیں فرماتے تھے، بلکہ اس قسم کی بحثوں کے جائز ہونے کا قرآن کریم سے بھی دو طرح اشارہ ملتا ہے:

اول یہ کہ قرآن کریم نے ان لفظوں کے ساتھ حضور کے سامنے آواز بلند کرنے کو منع فرمایا ہے:

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی۔

نبی کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو! (پ ۲۶ ع ۱۴)

اور اس طرح منع نہیں فرمایا: **لا ترفعوا اصواتکم بینکم عند النبی۔** نبی کے پاس اپنی آوازوں کو آپس میں بلند نہ کرو!

معلوم ہوا کہ حضور کی آواز پر آواز بلند کرنا منع ہے، مگر حضور کے سامنے آپس میں ایک دوسرے پر آواز بلند کرنا جائز ہے۔

دوسرے قرآن مجید نے یہ فرمایا:

کجھر بعضکم لبعض۔

یعنی جس طرح کہ ایک دوسرے پر آواز بلند کرتے ہو۔

معلوم ہوا کہ صحابہ کا ایک دوسرے پر آواز بلند کرنے میں کوئی حرج نہیں البتہ حضور کی آواز پر آواز بلند کرنا بربادیِ اعمال کا سبب ہے اور پھر یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آواز بلند کی؟ پہلے ان کا آواز بلند کرنا ثابت کیا جائے پھر اعتراض کیا جائے، بہت ممکن ہے کہ مجموعی طور پر ایسا ہوا ہو، اس لئے کہ جب بہت سے صحابہ حجرۂ مبارکہ میں حاضر تھے تو سب کی گفتگو سے آواز بلند ہونا یقینی ہے اور یہ گناہ نہیں اور یہ بھی گناہ ہو تو سب حاضرین یہاں تک کہ حضرت عباس وحضرت علی رضی اللہ عنہما پر بھی یہ گناہ عائد ہوگا۔ اور حضور کا ارشادِ گرامی لا ینبغی عندی تنازع یعنی میرے پاس جھگڑنا مناسب نہیں، اسی بات کی تائید کر رہا ہے کہ یہ گناہ نہیں بلکہ خلافِ اولیٰ ہے، اس لئے کہ زنا جو بربادیِ اعمال کا سبب نہیں ہے اس سے منع کرنے لئے بھی یوں نہیں کہا جاتا کہ زنا مناسب نہیں ہے۔

اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قوموا عنی۔ یعنی تم لوگ میرے پاس سے اٹھ جاؤ!

تو یہ کلام ان اقسام میں سے ہے جو مرض کے سبب مریض سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذراسی گفت وشنید کو برداشت نہیں کرتا اور پھر یہ خطاب تو سب حاضرین سے تھا جس میں لکھنے کا سامان لانے کی تائید کرنے والے اور مخالفت کرنے والے دونوں شامل تھے، تو صرف حضرت عمر ہی پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے، حضرت عباس وحضرت علی اور دوسرے لوگوں پر کیوں نہیں کیا جاتا؟

۴۔ مسلمانوں کی حق تلفی نہیں ہوئی

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ لکھنے کا سامان نہ دینے کے سبب مسلمانوں کی حق تلفی ہوئی، اس لئے کہ حق تلفی اس صورت میں ہوتی جبکہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے کوئی نئی بات

اور اللہ لوگوں کے شر سے تجھ کو محفوظ رکھے گا۔ (پ ۶، ع ۱۴)

کیا اس آیت کریمہ کے ہوتے ہوئے جبکہ ظاہری حیات کے آخری ایام تھے حضور حضرت عمر سے ڈر گئے اور خدائے تعالیٰ کے وعدہ پر کہ وہ لوگوں کے شر سے آپ کو محفوظ رکھے گا' حضور نے یقین نہ کیا؟ معاذ اللّٰہ من ذالك۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ خدائے تعالیٰ کا حکم نہیں تھا بلکہ آپ اپنی طرف سے لکھوانا چاہتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور نے اپنے اس خیال سے رجوع فرمایا کہ نہیں؟ اگر جواب دیا جائے کہ رجوع فرمالیا تو اس صورت میں سارا اعتراض ہی ختم ہو گیا اور اس واقعہ نے بھی موافقاتِ عمری میں سے ہو کر ان کی عزت کو اور چار چاند لگا دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ حضور نے رجوع نہیں فرمایا تو امت کی نفع بخش چیز کا چھوڑ دینا حضور پر لازم آیا اور یہ باطل ہے۔ اس لئے کہ خدائے تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رءوف رحیم۔

بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر بڑے ہی شفیق و مہربان۔ (پ ۱۱، ع ۵)

اور دوسری دلیل اس خیال کے باطل ہونے پر یہ ہے کہ جو بات آپ لکھنا چاہتے تھے وہ یا تو کوئی نئی بات تھی جو تبلیغ سابق پر زائد تھی یا تبلیغ سابق کو منسوخ کرنے والی اور اس کے مخالف تھی اور یا تبلیغ سابق کی تاکید تھی۔ پہلی اور دوسری صورت باطل ہے، اس لیے کہ آیت کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم کی تکذیب لازم آتی، اور تیسری صورت میں امت کی کوئی حق تلفی نہ ہوئی، اس لئے کہ حضور ﷺ کی تاکید خدائے تعالیٰ کی تاکید سے بڑھ کر نہیں ہے۔ تو جن لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی تاکید کا لحاظ نہیں ہوگا

ان کو حضور کی تاکید سے بھی کچھ فائدہ نہ پہنچے گا۔

اور حدیث شریف سے اس بے ہودہ خیال کے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو ابتدائے جواب میں لکھی گئی ہے اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بولنے سے پہلے حاضرین نے آپس میں جھگڑا کیا اور جو کچھ کہنا تھا کہا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوبارہ پوچھا، مگر حضور نے قلم و دوات منگانے اور لکھنے لکھانے سے خاموشی اختیار فرمائی۔ اگر یہ بات قطعی ہوتی تو آپ ہرگز خاموش نہ ہو جاتے اور اگر اس وقت خاموش ہو گئے تھے تو اس کے بعد پانچ روز ظاہری حیات کے ساتھ موجود رہے جس کا اقرار رافضی لوگوں کو بھی ہے تو اس درمیان میں اسے ضرور لکھا دیتے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ دینی معاملات میں سے کسی چیز کا لکھنا منظور نہ تھا بلکہ دنیوی معاملات میں کچھ کہنا تھا جس کی وصیت فرمائی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور ایلچیوں کی خاطر مدارات کرو اور تیسری چیز کہ جس سے اس حدیث شریف میں سکوت کا ذکر ہے غالباً حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی درستگی ہے، جیسا کہ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے:

اور اس بات پر کہ وہ دینی معاملہ نہ تھا دلیل یہ ہے کہ جب دوسری بار صحابہ کرام نے قلم دوات وغیرہ لانے کے بارے پوچھا تو حضور نے فرمایا:

ذرونی فالذی انا فیه خیر مما دعوتنی الیه۔

مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو کہ میں اپنے باطن سے مشاہدۂ حق میں مشغول ہوں اور یہ حالت اس سے بہتر ہے کہ جس کی طرف تم بلا رہے ہو۔

اگر کوئی دینی معاملہ یا تبلیغ کا پہنچانا منظور ہوتا تو بہتری کا معنی کیسے درست ہوتا؟ اس لئے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ انبیائے کرام کے حق میں وحی پہنچانے اور

دینی احکام جاری کرنے سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

اور اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جب سرکار اقدس ﷺ نے دوسری بار اس عالم سے بے تعلقی کا جواب ارشاد فرمایا تو حاضرین کو حسرت و یاس دامن گیر ہوئی اور ناامید ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا:

عندکم القرآن حسبکم کتاب اللّٰہ۔

مطلب یہ ہوا کہ حضور کے اس جواب سے تم لوگ مایوس نہ ہو، تمہاری تعلیم اور تمہارے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کلام اس گفتگو کے بعد صحابہ کرام کی تسلی کے لئے فرمایا، نہ کہ تحریر سے منع کرنے لئے۔

اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس واقعہ کے وقت حاضر تھے، اس پر رافضی سنی دونوں کا اتفاق ہے، مگر حضرت عمر پر یا حاضرین مجلس میں سے کسی پر کہ جن لوگوں نے تحریر کی مخالفت کی تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی پر انکار یا افسوس ہرگز منقول نہیں، نہ آپ کے زمانہ خلافت میں، نہ آپ کی پوری زندگی میں اور نہ آپ کی وفات کے بعد، نہ کسی شیعہ سے اور نہ کسی سنی سے۔ لہٰذا اگر حضرت عمر اس معاملہ میں خطاوار ہیں تو حضرت علی بھی اس کام کی تائید میں ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے علاوہ کہ جو اس وقت کم سن تھے کسی کا افسوس اور کسی کی حسرت کسی پر ہرگز منقول نہیں ہوئی، اگر کوئی بہت بڑی چیز فوت ہوگئی ہوتی تو بڑے بڑے صحابہ اور کم از کم حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر یقیناً حسرت و افسوس ظاہر کرتے اور تحریر سے روکنے والوں کی شکایت زبان پر ضرور لاتے۔

اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب کسی اہم بات کا لکھنا منظور نہ تھا تو حضور نے یہ کیوں فرمایا: لن تضلوا بعدی۔ یعنی تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ دین کے بارے میں کوئی اہم بات تھی اس لئے کہ دین میں خلل پڑنا ہی گمراہی کے معنی ہیں۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ ضلال عرب کی بولی میں جیسا کہ دین کی گمراہی کے معنی میں آتا ہے دنیا کے معاملات میں بدتدبیری کے معنی میں بھی بہت بولا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قول حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں منقول ہے:

ان اباناً لفی ضلال مبین۔

یعنی بے شک ہمارے باپ صریح غلطی پر ہیں۔ (پارہ ۱۲، رکوع ۱۲)

اور اسی سورۃ یوسف میں دوسری جگہ ہے:

انك لفی ضلالك القدیم۔

یعنی بے شک آپ اپنی اسی پرانی غلطی پر ہیں۔ (پارہ ۱۳، رکوع ۵)

ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کافر نہ تھے کہ اپنے باپ یعقوب علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو گمراہ سمجھتے۔ معاذ اللہ۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ دنیوی معاملات میں آپ بے تدبیری برتتے ہیں کہ ہم لوگوں سے جو ہر طرح کی خدمتیں کرتے ہیں الفت کم رکھتے ہیں اور جو لوگ چھوٹے ہیں اور خدمت کرنے میں قاصر ہیں ان سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

لہٰذا اسی طرح یہاں بھی ''تضلو'' سے مراد ملک کی تدبیر میں خطا ہے نہ کہ دین کی گمراہی۔ اور واضح دلیل اس پر یہ ہے کہ ۲۳ برس کی مدت میں قرآن کا نزول اور احادیث کریمہ کا ارشاد ان کی گمراہی کے دفع کرنے کے لیے اگر کافی نہ ہو تو چند سطروں کی تحریر اس کام کے لیے کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

اور بعض لوگوں کے دل میں یہ بھی خیال گزرتا ہے کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کا معاملہ لکھنا چاہتے تھے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے روک دینے سے یہ اہم معاملہ رہ گیا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ خلافت کا معاملہ لکھنا ہرگز منظور نہ تھا، اس لئے کہ حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق حضور نے اسی مرض میں ارادہ فرمایا تھا، جیسا کہ مسلم شریف جلد ۲ ص ۲۷۳ میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

ادعی لی ابا بکر اباك و اخاك حتی اکتب لهما کتابا فانی اخاف ان یتمنّٰی متمن و یقول قائل انا اولی و یابی اللّٰه و المؤمنون الا ابا بکر۔

اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ تا کہ میں ان کے لئے وصیت نامہ لکھ دوں، اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں کہ کوئی آرزو کرنے والا آرزو کرے یا کوئی کہنے والا کہے کہ میں افضل ہوں حالانکہ خدا اور مومنین علاوہ ابوبکر کے کسی کو قبول نہ کریں گے۔

مگر ایسا ارادہ فرمانے کے بعد پھر حضرت عمر یا کسی دوسرے کی ممانعت کے بغیر حضور نے خود بخود لکھنا موقوف کر دیا۔

اور پھر اگر خلافت کے لئے وصیت ہی کرنی تھی تو اس کے لئے لکھنا ضروری نہ تھا بلکہ جو لوگ حجرۂ مبارکہ میں موجود تھے ان کے سامنے زبانی وصیت کر دینا ہی کافی تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے لکھنے سے منع نہیں کیا اور اگر منع کرنا فرض بھی کر لیا جائے تو اس سے امت کی کوئی حق تلفی ہرگز نہیں ہوئی۔ یہ رافضیوں کا وسوسہ ہے اور وسوسہ کا کوئی علاج نہیں۔

ھذا ما ظھر لی و ھو تعالٰی و رسوله الاعلٰی اعلم جل جلاله و صلی اللّٰه علیه و سلم۔

کتبہ

جلال الدین احمد الامجدی

۴ ربیع الآخر ۱۴۰۱ھ

سابق فتویٰ پر ایک شبہہ اور اس کا جواب

مسئلہ

از

حیات علی بھاؤپوری، بھاؤپور، ضلع بستی

مکرمی حضرت مفتی صاحب قبلہ دام الطافکم!

السلام علیکم!

التماس ایں کہ حدیث قرطاس کے بارے میں آپ کے فتویٰ کا مطالعہ کیا، بجز عبارت ذیل کے آپ نے بہت خوب تحریر فرمایا ہے، وہ عبارت یہ ہے کہ "محبوب خدا ﷺ کا ہر کلام وحی الٰہی نہیں ہے" تو یہ نص صریح و ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں اطمینان بخش مدلل جواب تحریر فرمائیں! فقط



الجواب

باسمہ تعالٰی و الصلاۃ و السلام علی رسولہ الاعلی۔
محترم المقام زید احترامکم!
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!
ثم السلام علیکم!
محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کلام وحی خدا نہیں ہے۔ یہ بات نص صریح کے خلاف نہیں، اس لئے کہ آیت کریمہ و ما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحٰی میں ھو کا مرجع قرآن عظیم ہے، جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے کہ

انہ ضمیر معلوم و ھو القرآن کانہ یقول ما القرآن الا وحی۔

یعنی آیت کریمہ ان ھو الا وحی یوحٰی میں ھو ضمیر کا مرجع قرآن ہے، گویا کہ خدائے تعالٰی فرماتا ہے کہ قرآن صرف وحی ہے۔
اور تفسیر روح البیان میں ہے:

ان ھو ای ما الذی ینطق بہ من القرآن الا وحی من اللہ تعالٰی یوحی الیہ بواسطۃ جبرئیل علیہ السلام۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب وحی کیا جاتا ہے۔

اور مدارک میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں ہے:

و ما اتاکم به من القرآن لیس بمنطق یصدر عن هواه و رایه انما هو وحی من عند الله یوحی الیه۔

یعنی جو قرآن کہ رسول تمہارے پاس لائے ہیں وہ ایسا کلام نہیں ہے جو ان کی خواہش اور رائے سے ہو، وہ صرف وحی الٰہی ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔

اور تفسیر ابوالسعود میں ہے:

ان هو ای ما الذی ینطق به من القرآن الا وحی من الله تعالٰی۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے رسول قرآن بتاتے ہیں وہ صرف وحی الٰہی ہے۔

اور تفسیر خازن میں ہے:

و ما ینطق عن الهوٰی ای بالهوٰی و المعنٰی لا یتکلم بالباطل و ذالك انهم قالوا ان محمدا یقول القرآن من تلقاء نفسه ان هو ای ما هو یعنی القرآن و قیل نطقه فی الدین الا وحی من الله یوحی الیه۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ کفار و مشرکین کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن اپنی طرف سے کہتے ہیں، اس لئے آیت کریمہ کا یہ معنی ہوا کہ وہ باطل کلام نہیں فرماتے ہیں۔ قرآن اور بعض لوگوں نے کہا کہ ان کا ہر وہ کلام جو دین کے بارے میں ہو صرف وحی الٰہی ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔

اور معالم التنزیل میں و ما ینطق عن الهوٰی کی تفسیر خازن کی مثل لکھنے کے بعد تحریر فرمایا:

ان هو ما نطقه فی الدین و قیل القرآن۔

یعنی دین کے بارے میں رسول کا کلام اور بعض لوگوں نے کہا کہ قرآن صرف وحی خداوندی ہے جو رسول کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔

ان معتبر تفسیروں سے واضح ہو گیا کہ آیت کریمہ ان هو الا وحی یوحی میں هو کا مرجع قرآن عظیم ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن وحی الٰہی ہے نہ کہ ہر کلام۔

اور تفسیر معالم التنزیل میں جو هو کا مرجع نطقه فی الدین بتایا تو اس سے بھی ہر کلام کا وحی الٰہی ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف دینی کلام کا وحی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

البتہ تفسیر جمل اور صاوی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و افعال اور سب احوال وحی الٰہی ہیں، جیسا کہ ہمارے مقررین عام طور پر بیان کرتے ہیں، مگر اس کے بارے میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ وہ ظاہر کے خلاف ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ اس آیت کریمہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کا وحی ثابت کرنا ایک وہم ہے، اس لئے کہ هو کا مرجع اگر قرآن کو تسلیم کیا جائے تو اس معنی کا خلاف ہونا ظاہر ہے اور اگر هو سے مراد حضور کا قول ہو تو ان کے قول سے وہی قول مراد ہے کہ جسے کفار و مشرکین شاعر کا قول کہتے تھے، تو خدائے تعالیٰ نے رد کرتے ہوئے فرمایا: و لا بقول شاعر، اور وہ قول قرآن کریم ہی ہے۔ علامہ امام رازی کی اصل عبارت یہ ہے:

الظاهر خلاف ما هو المشهور عند بعض المفسرين و هو ان النبی صلی اللہ علیه و سلم ما کان ینطق الا عن وحی و لا حجة لمن توهم هذا فی الآیة لان قوله تعالٰی: ان هو الا وحی یوحی ان کان ضمیر القرآن فظاهر و ان کان ضمیرا عائدا الی قوله فالمراد من قوله هو القول الذی کانوا یقولون

فیه انه قول شاعر و رد الله علیهم فقال: و لا بقول شاعر و ذالك القول هو القرآن۔

اور علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حضور سید عالم ﷺ کے ہر قول کو وحی الٰہی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور ﷺ نے کبھی اپنے اجتہاد سے کچھ نہیں فرمایا اور یہ بھی ظاہر کے خلاف ہے، اس لیے کہ حضور ﷺ نے لڑائیوں میں اجتہاد فرمایا ہے اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو یا شہد کو جب حضور نے اپنے لیے حرام فرمالیا تو آیت کریمہ نازل ہوئی: یا ایها النبی لم تحرم؟ یعنی اے نبی! تم نے کیوں حرام فرمالیا؟ (پارہ ۲۸ سورہ تحریم) معلوم ہوا کہ اگر حضور کا حرام فرمانا وحی الٰہی ہوتا تو لم تحرم نہ فرمایا جاتا، اسی طرح حضور ﷺ نے جب کچھ لوگوں کو غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی اجازت دے دی تو آیت کریمہ عفا الله عنك لم اذنت لهم نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا۔ (پ۱۰ ع ۱۲) ثابت ہوا کہ حضور کا ہر کلام وحی الٰہی نہیں، ورنہ حضور کے اجازت دینے پر لم اذنت لهم نہ فرمایا جاتا۔ علامہ امام رازی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

هذا یدل علی انه صلی الله علیه و سلم لم یجتهد و هو خلاف الظاهر فانه فی الحروب اجتهد و حرم ما قال الله: لم تحرم و اذن لمن قال الله تعالی: عفا الله عنك لم اذنت لهم۔ (تفسیر کبیر جلد ہفتم ص ۷۰۰)

علاوہ ان کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کا ہر قول وحی الٰہی نہیں ہے، مثلاً بخاری شریف جلد دوم ص ۶۷۴ میں ہے کہ سرکار اقدس ﷺ نے (کسی مصلحت سے) عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

لا تصل علی احد منھم مات ابدا و لا تقم علی قبرہ۔ (پ ۱۰ ع ۱۶)
اور کھجوروں کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مشہور ہے:

انتم اعلم بامور دنیاکم۔

اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھارہ دن تک طائف کا محاصرہ جاری رکھا اور وہ فتح نہیں ہوا۔ حضرت نوفل بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے مشورے پر حضور نے محاصرہ اٹھالیا۔

(زرقانی جلد سوم ص ۳۲)

معلوم ہوا کہ طائف کا محاصرہ وحی الٰہی نہیں تھا، ورنہ صحابی کے کہنے پر حضور محاصرہ ہرگز نہ اٹھاتے۔

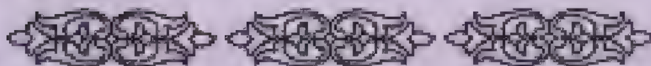
ان تمام شواہد سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل وحی الٰہی نہیں ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے کہا کہ ان کا ہر قول و فعل وحی الٰہی ہے تو ان کا مطلب یا تو یہ ہے کہ دینی امور میں حضور کا ہر قول و فعل وحی الٰہی ہے، جیسا کہ معالم التنزیل میں فرمایا اور یا تو ان لوگوں کا قول عام مخصوص منہ البعض ہے۔

ھٰذا ما ظھر لی و العلم بالحق عند اللّٰہ تعالٰی و رسولہ عز اسمہ و صلی اللّٰہ علیہ و سلم۔

کتبہ

جلال الدین احمد الامجدی

۱۰ر جمادی الاخریٰ ۱۴۰۲ھ



حدیث قرطاس

بے خبر اور ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے کبھی قرطاس کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ حضرت اقدس ﷺ نے اپنی ظاہری حیوۃ طیبہ کے آخری خمیس کو اپنے حرم سرا میں اہل بیت کے مردوں سے کہا کہ لکھنے کے لئے کوئی چیز (دوات، قلم، کاغذ) لاؤ میں تمہارے لئے کچھ وصیت لکھوں تا کہ میرے بعد تم صراط مستقیم پر ثابت قدم رہو۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے مسجد شریف میں جا کر دوات قلم طلب فرمائی تو امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہمیں قرآن کریم کافی ہے کیا آنحضرت ﷺ ہمیں داغ مفارقت تو نہیں دینا چاہتے؟ اس بات کو سمجھو!!

یہ روایت اہل سنت کی کتابوں میں ہو یا اہل تشیع کی کتابوں میں بہر صورت قرآن کریم کی آیت کریمہ (و لا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون) یعنی آپ اپنے ہاتھ مبارک سے کبھی اس کو نہ لکھنا تا کہ گمراہ کرنے والے لوگ شک پیدا نہ کریں۔ (کہ حضور ﷺ خود لکھ سکتے تھے اور قرآن کریم بھی خود لکھا ہے خدا کی طرف سے نہیں) اب یہ نفی ہو یا نہی۔ بہر صورت آنحضرت ﷺ کا اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا ممنوع اور محال ہے اور روایت میں ہے کہ میں لکھوں۔ دوسرا بفرض تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں۔ حضرت علی کی خلافت اور وہ بھی بلافصل اس سے کیسے ثابت ہوگی۔

تیسرا: اہل بیت کے مردوں میں حضرت علی موجود تھے تو ان کو دوات قلم پیش کرنے کا حکم ہوا۔ جیسا کہ "ایتونی" کا صیغہ جمع مذکر اسی امر پر دلالت کرتا ہے۔ فرض کرو کہ حضرت عمر نے حسبنا کتاب اللہ یعنی ہمیں قرآن کریم کافی ہے۔ فرمایا ہو۔ تو سوال یہ ہے کہ حضرت علی نے حضرت عمر کے کہنے پر عمل کرنا تھا رسول اللہ ﷺ کے حکم پر؟ پھر حضرت علی نے کس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے دوات و قلم و کاغذ پیش نہ کیا۔

چوتھا: فرض کریں حضور خلافت ہی لکھتے (جس کا ذکر تک روایت میں نہیں) مگر جب حضور ﷺ پہلے فرما رہے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر ہوگا۔ اس کے بعد عمر ہوگا رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے دیکھو تفسیر صافی جلد ۲ صفحہ ۳۲۰۔ اسی طرح تفسیر قمی اس آیت کریمہ کے تحت قال نبانی العلیم الخبیر ہ (پارہ ۲۸ سورہ تحریم) تفسیر امام حسن عسکری اور باقی تمام اہل تشیع کی معتبر ترین تفاسیر میں حضور اقدس ﷺ سے یہ روایت ثابت ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمان کے خلاف اور اپنے ارشاد کے خلاف کوئی دوسری خلافت لکھنے لگے تھے۔

ہم پہلے حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واضح اور غیر مبہم خطبات آپ کو سنا چکے ہیں کہ حضرت علی سے جب رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد خلافت کی بیعت کرنے کے بارے میں کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میری خلافت کا زمانہ نہیں آیا۔ اس وقت میری خلافت کا سوال ایسا ہے جیسے کوئی قبل از وقت کچے میوے توڑے یا کسی دوسرے کی زمین میں کھیتی باڑی شروع کر دے۔ اور یہ کہ میرے ذمہ یہ ہے کہ میں دوسروں کی اطاعت کروں اور یہ کہ بیعت کرنے پر میرے لئے دوسروں کی اطاعت کا عہد و پیمان مقدم ہے میرے لئے ممکن ہی نہیں کہ ابوبکر کی بیعت کی مخالفت کروں۔ پھر ان کا خود بھی بیعت کرنا۔ یہ تمام تر روایات خلافت علی رضی اللہ عنہ کی تحریک کے منافی بلکہ مناقض ہیں۔

شوائظ البرقات

حضرت پیر سید قطب علی شاہ بخاری

حضرت پیر سید [illegible] حسین شاہ بخاری صاحب

طعن سوم۔ ذکرِ قرطاس

شیعہ کہتے ہیں کہ بیماری کی حالت میں حضرت ؐ نے کاغذ قلم دوات مانگا۔ تو صحابہ ؓ متردّد ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔کہ اس وقت حضرت ؐ کی حالت ہزیان ہے۔ ہم کو خدا کا قرآن کافی ہے۔ پس حضرت عمرؓ نے بے ادبی کی اور حکم حضرت ؐ کی تعمیل نہ کی۔

جواب یہ قصہ کتب اہل سنت میں اس طرح پر ہے کہ پنجشنبہ کے دن حضرت ؐ کی بیماری نہایت سخت ہوئی۔ اور درد غالب ہوا۔ تو حضرت ؐ نے فرمایا کہ لاؤ میں تم کو کاغذ لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی نہ بھٹکو۔ تو اصحابہ ؓ نے کاغذ لانے نہ لانے میں گفتگو کی۔ بعضوں نے کہا کہ لانا چاہیئے۔ بعض کہنے لگے کہ حضرتؐ کو لکھنے میں تکلیف ہوگی۔ اور بعض نے کہا کہ شدت مرض کے سبب حضرتؐ کو ہزیان نہ ہوا ہو اور بعضوں نے کہا کہ اس کو پھر حضرت ؐ سے دریافت کرنا چاہیئے۔ جب حضرت عمرؓ نے اس طرح صحابہ ؓ کو جھگڑتے ہوئے دیکھا تو فرمایا۔ اے بھائیو! خاموش رہو۔ اس وقت حضرت ؐ کو درد کی نہایت سخت تکلیف ہے۔ جھگڑنے سے کیا فائدہ ہم کو کتاب اللہ کافی ہے۔ آخر بعض صحابہ ؓ نے حضرتؐ سے کیفیت قرطاس دریافت کی تو حضرت ؐ نے فرمایا کہ تم اس وقت مجھ سے علیحدہ ہوجاؤ۔ اور مجھ کو نہ بلاؤ کہ جس میں اب میں مشغول ہوں۔ اس سے بہتر ہے۔ جس کو تم پوچھتے ہو۔

دیکھو عمرؓ رضی اللہ عنہ کی منشا مطابق تو حضرت ؐ نے بھی فرمایا کہ اب مجھ کو نہ بلاؤ۔ پس اصل بات تو اتنی ہے کہ جس سے نہ کوئی بے ادبی نہ خطا ثابت ہوتا ہے۔ نہ کہیں پر حضرت ؐ رنج نہ خفاء ہوئے۔ باقی عناد قلبی کے سبب شیعوں نے حضرت عمرؓ پر یہ الزام خام آپ کی جانب سے عائد کر دیئے۔ جیسا کہا کہ حضرت عمرؓ نے بے ادبی کی جو ہزیان کی نسبت حضرت ؐ کو دی۔ اور کہا کہ ہم کو خدا کا قرآن کافی ہے۔ اور بھی

حضرتؐ نے ان کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔

اور یہ لاف تمہاری محض خلاف ہے۔ حضرت عمرؓ نے لفظ ہزیان نہیں کہا۔ ہماری کتب میں اس بہتان کا کوئی بیان نہیں۔ مگر جس نے یہ کہا بھی ہے اس نے بھی نہ کوئی بے ادبی نہ خطا کیا۔ ہزیان ایک مرض کا نام ہے یعنی اختلاط ہوش جس کو بے ہوشی و غشی بھی کہتے ہیں کہ اکثر اوقات یہ معصوم و غیر معصوم کو بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت موسےؑ کے حق میں بھی جناب باری فرماتا ہے فَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًاۙ یعنی پڑا موسیٰؑ بے ہوش ہو کر اور حدیث میں آیا ہے۔ کہ نفخ صور میں تو سب پیغمبرؑ بے ہوش ہو جاویں گے۔ سوائے ایک حضرت موسےؑ کے اور نیند میں بھی بے ہوشی اکثر اوقات ہر کس کے ساتھ ہو جاتی ہے جو وقت نماز اور عبادت کا بھی قضا ہو جاتا ہے۔

جیسا تمہاری کافی کلینی میں بھی ۔لعہ القریش مذکور ہے۔ کہ شب در سفر نماز صبح قضا شد۔

اور اسی طرح سہو و نسیان تو معصوم غیر معصوم کو نماز میں بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ نماز ظہر کی حضرتؐ نے پانچ رکعتیں پڑھیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا حضرتؐ نماز بڑھ گئی ہے۔ جو آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں۔ تب حضرتؐ نے فرمایا کہ میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں ۔ بھول و نسیان سے خالی نہیں ہوں۔

اور ایسی بے ہوشی اور غشی کے الفاظ تو تم خود اپنے مرثیوں میں بھی نسبت امام سید ساجدینؓ و امام علی اصغرؓ اور جناب سائیں سکینہؓ وغیر ہم اہل بیت رسولؐ اللہ کے حق میں بولتے ہو پھر اس بیہوشی و غشی کے لفظ کہنے والے سے بھی خطا اور بے ادبی ہوئی

ہاں اگر آپ کے زعم باطل میں بے ادبی تھی۔ تو حضرتؐ کے قرابتین حاضرین

خصوصاً" جناب امیرؓ و دیگر بنی ہاشمؓ پر واجب تھا کہ اس خطا پر پکڑتے اور قتل کرتے۔ پھر کیوں کسی نے اس کو اس کہنے پر سزا نہ دی۔ اور نہ کچھ چون چرا کی۔ پس اس طرح تو معاذ اللہ جناب امیرؓ وغیرہ بھی اس خطاوار سے بڑھ کر گنہگار ٹھہرے۔

یا اس سے تمہارے بہتان بدگمان سے یہ معلوم ہوا کہ جناب امیرؓ تو حضرتؐ کے زمانہ میں بھی عمرؓ وغیرہ سے اس قدر ڈرتے تھے۔ جو ایسے بے ادب کو بھی بھلا بُرا نہ کہہ سکے۔ کیوں وہ باتیں بناتے ہو کہ جس میں شیر خداؑ کی بھی ہتک ہو۔

اور جو حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم کو کتاب اللہ کافی ہے۔ تو کیا گناہ کیا۔ ارے یہ کہنا ان کا اس مصلحت سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ سبب جھگڑنے صحابہؓ کے تکلیف نہ ہو۔ اور یہ امر ہرگز داخل نافرمانی نہیں ہے بلکہ عین محبت اور خیر خواہی ہے۔ جیسا لوگ عین شدت بیماری میں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کو تکلیف دینے سے بچاتے ہیں۔ تاکہ بعض موقعہ تو ان کو بُلانے تک بھی نہیں چاہتے۔

اور جو صحابہؓ کو حضرتؐ نے فرمایا کہ اب میرے پاس سے تم چلے جاؤ۔ تو یہ کہنا بھی حضرتؐ کا عتابانہ تھا۔ اگر عتاباً" تھا تو اس سے بھی جناب امیرؓ و دیگر بنی ہاشم جو اس وقت موجود تھے بَری نہیں ہو سکتے پھر یہ الزام بھی آپ کے کس کام آیا اور جو کہا کہ حضرت عمرؓ نے حکم رسولؐ کی تعمیل نہ کی۔ تو اس میں جناب امیر و حسنین علیہم السلام اور دیگر بنی ہاشمؓ بھی تو موجود تھے۔ اور خاص کر کسی کا نام بھی لے کر حضرتؐ نے قرطاس طلب نہ فرمایا تھا۔ اس طرح تو وہ بھی بقول تمہارے مرتکب معصیت ٹھہرے بلکہ ان اکرامؓ پر تو اس کام کا ہر سے زیادہ الزام آتا ہے۔ کیونکہ وہ تو حضرتؐ کے خاص اقرباء اہل بیتؓ تھے۔ ان کو کس نے روکا اور منع کیا تھا۔

الغرض جناب امیرؓ پر تو یوں فرض تھا۔ کہ جھٹ پٹ کاغذ و قلم دوات لے کر حاضر خدمت ہو جاتے۔ کیا وجہ تھی کہ وہ بھی نافرمان صحابہؓ میں شریک رہے اور بقول تمہارے یہ بھی آپ کو معلوم تھا کہ ضرور سند میری ہی نیابت کی لکھی جاوے گی

تب بھی آپ نے کچھ توجہ نہ فرمائی۔ اور حکم رسول ؐ کا خیال بھی نہ کیا۔ حالانکہ یہ بھی آپ جانتے تھے کہ قول پیغمبرؐ کا وحی ہے۔ پس اس تمہارے طعن میں تو ہر سے بڑھ کر جناب امیرؓ کا نافرمان ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ

اسی واسطے تو شیعہ جدید نے جب اس تمہید کو دیکھا۔ فی الواقعہ جناب امیرؓ و اہل بیتؓ بھی اس نقص سے بچ نہیں سکتے۔ کہ اکثر پشیمان ہو کر اس طعن کو اپنی تصنیفات سے نکالنے لگے۔ جیسا کہ صاحب معیار الہدے و نصیر الدین وغیرہ نے اپنی کتابوں میں کچھ ذکر قرطاس کا نہیں لکھا۔ اور بعضے بے چارے شرمندگی کے مارے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جناب امیرؓ اس وقت موجود نہ تھے یہ محض جھوٹ بھلا ایسی نازک حالت میں حضرتؐ کو چھوڑ کر وہ کہاں گئے تھے۔ کسی ملک فتح کرنے کو یا اور کسی کام میں مشغول تھے۔ اور دیگر بنی ہاشمؓ و اہل بیتؓ بھی اس وقت کہاں تشریف رکھتے تھے اس کے بعد بھی تو حضرتؐ چار دن زندہ رہے۔ تب بھی کوئی موقعہ کسی کے آنے کا نہ ملا۔

پس نہ تو اس بات مجہول کو کسی کا عقل قبول کرتا ہے۔ نہ کوئی اور ثبوت دینے کی حاجت ہے۔ سب عقلاً اس کو خود جھٹلا سکتے ہیں۔

اور بھی اس طعن میں شیعوں کا یہ گمان ہے کہ قرطاس طلب کرنے سے حضرتؐ کی یہ مراد تھی کہ خلافت جناب امیرؓ کو لکھ دیں۔ جیسا حق الیقین کے طعن اول مطاعن عمرؓ میں ارقام ہے (باید کہ امر مجمل کہ مشتمل بر مصالح امت باشد تا روز قیامت وایں نسبت مگر آنکہ خلیفہ و جانشین عالم و عادل و معصوم تعین کند کہ عالم باشد بجمیع مصالح امت و عموم مسائل دین و خطا بردرہ انبیاء شد۔ یہ وہم بھی شیعوں کا محض غلط اور خلاف ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ جب عام تمہاری کتابوں میں ارقام ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بروز غدیر ستر ہزار آدمیوں کے روبرو خطبہ پڑھا۔ اور جناب امیرؓ کو اپنا نائب اور وصی بنایا۔ اور اس دم تمام حاضرین نے بیعت بھی کی۔ پس جس بات کو ستر

ہزار آدمی جانتے ہوں تو پھر اس معاملہ میں حضرتؐ کو پرچہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔
یا تو کہو کہ وہ ہمارا دعوے غدیر کا غلط ہے اب ہی جناب امیرؓ کو اپنا وصی اور خلیفہ بنانے لگے تھے۔ سو ماشاء ہماری بھی تو یہی مراد ہے۔ کہ ایک تمہارا دعوے اور دوسرے دعوے کو خود جھوٹا بناتا ہے۔ پھر وہ بھی تو ہاتھ میں نہیں آتا۔
یا کہو کہ اس فرمان غد لوگوں نے عمل نہ کیا تھا۔ اس واسطے حضرتؐ پھر تحریر کرتے تھے۔ تو کیا حضرتؐ کو یہ بھی خیال نہ آیا ہوگا کہ جب میرے روبرو، کسی نے میرا کہا نہیں مانا تو پیچھے اس میرے لکھے پر کون عمل کرے گا۔ پس یہ تقریر تمہاری تو کسی طرح بھی عقل پذیر نہیں ہو سکتی۔
دوسرا بقول تمہارے جب پیغمبرؐ خدا کو عرش مجید پر بھی ستر بار تاکید ہوئی کہ تم علیؓ کو اپنا خلیفہ بناؤ اور وصی کرو کہ جس کا ذکر باب خلافت میں آوے گا۔ تو باوجود اتنی تاکید کے پھر کیوں حضرت عمرؓ کے کہنے سے رُک گئے۔ تحریر تو کیا لب کشائی بھی نہ فرمائی۔ کیا فرمان الٰہی سے عمرؓ کا زیادہ ڈر تھا۔ جو اس کے خوف سے فرض خدا و حق رسالت بھی ادا نہ کرسکے۔ کہ جس کے واسطے حق تعالیٰ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ تاکیداً" امر تھا کہ اے محمدؐ اگر تو نے ایک میرے امر کو نہ پہنچایا تو پس تو نے نہ پہنچایا رسالت میری کو تو کیا وجہ تھی کہ تب بھی حضرتؐ اس کام کو سر انجام نہ کرسکے۔ اور مرتے دَم بھی حضرت عمرؓ کا اس قدر خوف اندیشہ رہا کہ اس وقت بھی امر حق کو ظاہر نہ کر چلے۔ دیکھو اس تمہارے بہتان سے تو توبہ توبہ معاذ اللہ حضرتؐ بھی خدا کے نافرمان ہوگئے۔ نعوذُ باللہِ مِنۡ ذالِکَ۔
اے شیعو! اگر خلافت جناب امیرؓ کے لئے خدا اتنی تاکید فرماتا۔ اور حضرتؐ کے بھی قرطاس طلب کرنے سے یہی مراد ہوتی۔ تو پھر کیوں اس حکم خدا کو آپ ادا نہ کرتے۔ اگرچہ کاغذ نہ لکھا گیا تھا۔ تو کچھ زبانی ہی وصیت فرما جاتے۔ گو لوگ بھی مانتے یا نہ مانتے۔ مگر آپ سے تو فرض خدا و حق رسالت ادا ہوجاتا۔

اور بھی یہ واقع تو پنجشنبہ کو ہوا تھا۔ پھر دو شنبہ کو حضرتؐ نے رحلت فرمائی جب اتنے عرصہ میں بھی نہ حضرتؐ نے کوئی تحریر فرمائی۔ نہ وصیت کی نہ جناب امیرؓ ہی کاغذ لائے۔ تو پس معلوم ہوا کہ شیعوں کا دعوے بالکل جھوٹا ہے۔ اور قرطاس کا طلب فرمانا بھی خلافت کے لئے نہ تھا اور نہ کوئی یہ امر بالوحی تھا۔ اگر بالوحی ہوتا تو حضرتؐ ضرور ہی ابلاغ فرماتے۔ اس طرح ہرگز چپ چاپ نہ ہو جاتے۔

ہاں اگر یہ کہا جاوے کہ طلب قرطاس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ کی خلافت تحریر فرماتے تھے۔ تو یہ نظیر تو دلپذیر ہو جاتی ہے کیونکہ یہ بات تو اور بھی چند وجوہات سے صادق آتی ہے۔ اول تو ان کی خلافت کے اشارات میں اور بھی بہت احادیث ہیں۔

جیسا کہ تمہاری کتاب مجمع البیان میں بھی اس آیت کریمہ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا کی تفسیر میں یہ حدیث تحریر ہے۔ ترجمہ رسول اللہ نے حفصہؓ سے فرمایا کہ میرے بعد ابوبکرؓ و تیرا باپ یعنی عمرؓ مالک امت ہونگے۔ اور بادشاہی کریں گے۔ حفصہؓ یہ راز سن کر خوش ہو گئیں۔ اور عائشہؓ سے یہ بھید کہہ دیا۔ دیکھو اگر اس راز پوشیدہ کو حضرتؐ لکھنا چاہتے ہوں تو کیا ٹھیک اس منگوانے قرطاس کی تصدیق ہوتی ہے۔

دوسرا جب ایسی مرض الموت میں بھی صدیق اکبرؓ کو حضرتؐ نے اپنی جا بجا نماز میں لوگوں کا امام بنایا کہ جس سے ان کے خلیفہ ہونے کا اشارہ بھی ظہور میں آیا۔ اگر ایسا ہی حضرتؐ ان کی خلافت لکھتے ہوں۔ تو یہ گمان بھی کیسا قابل اطمینان ہے۔

تیسرا یا تو حضرتؐ کا ارادہ اس وصیت لکھنے کا تھا جس کا ذکر خلافت میں آوے گا جو تم کہتے ہو کہ جناب امیرؓ کو حضرتؐ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ جب حضرت شیخین ؓ خلیفہ ہوں تو تم ان سے جھگڑا نہ کرنا کہ انتظام اسلام میں خلل نہ ہو۔ پس اس طرح بھی اس قرطاس کا لکھنا قیاس میں آ سکتا ہے۔

اے شیعو۔ ذرا تو آپ ہی منصف ہو کر انصاف کرو کہ طلب قرطاس میں ٹھیک دعوے ہمارا تصدیق ہوتا ہے۔ یا کہ تمہارا کچھ ہی کہہ دو۔ نہیں تو جھوٹے کو جھوٹا تو کہو۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

اور جو کچھ تمہیں رسول عطاء فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو (سورہ حشر)

تفہیم البخاری

شرح

صحیح البخاری

حصہ اول

شیخ الحدیث علامہ غلام رسول رضوی جامعہ رضویہ فیصل آباد

ناشر: صاحبزادہ محمد حبیب الرحمٰن رضوی جامعہ سراجیہ رسولیہ رضویہ اعظم آباد فیصل آباد

۱۱۴ ـــ ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری زیادہ ہوگئی تو آپ نے فرمایا میرے پاس کتابت کی چیزیں لاؤ میں تمہارے لئے تحریر کر دوں اس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے۔ حضرت عمر فاروق نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے وہ ہمیں کافی ہے اس پر اہل مجلس میں اختلاف ہوا اور مختلف آوازیں زیادہ ہوئیں تو آپ نے فرمایا: یہاں سے اٹھ جاؤ میرے پاس جھگڑا مناسب نہیں حضرت ابن عباس یہ کہتے ہوئے باہر آئے۔ مصیبت ہے بہت بڑی مصیبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تحریر کے درمیان کیا حائل ہوگیا۔

۱۱۴ ـــ شرح: یہ جاننا ضروری ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تندرستی اور بیماری کی حالت میں جھوٹ اور احکام شرعیہ سے کسی شئی کے ردو بدل میں معصوم ہیں اور اسی طرح مامور بہ کے بیان کے ترک اور اللہ تعالیٰ نے جو آپ پر تبلیغ فرض فرمائی ہے۔ اس کے ترک سے بھی معصوم ہیں اور اجسام کے عارض ہونے والے امراض جن میں کوئی نقص نہ ہو سے معصوم نہیں۔ حدیث شریف میں حضرت عمر فاروق کے قول ’’حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ‘‘ میں ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے جھگڑا کیا۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا رد نہیں ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کا ارادہ فرمایا جبکہ اس میں کوئی مصلحت دیکھی یا اس بارے میں وحی آئی پھر اس کے ترک میں مصلحت دیکھی یا اس طرح کی وحی آئی اور ارادہ منسوخ کر دیا۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ’’قُوْمُوْا عَنِّیْ‘‘، سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا حکم واجب نہ تھا، ورنہ لوگوں کے اختلاف کرنے سے اسے ترک نہ کرتے؛ ورنہ آپ کی مخالفت پر تبلیغ کا ترک لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔ اہل تشیع کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تحریر کرنا تھی جس میں عمر فاروق حائل واقع ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے خلافت تحریر کرنا تھی تو اس کے لئے کوئی قرینہ ہونا چاہئیے۔ دلیل کے بغیر دعویٰ بے کار ہوتا ہے۔ اہل سنت یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کے لئے خلافت لکھنا تھی؛ چنانچہ تفسیر صافی صـ ۱۷ ج ۲ میں قمی کا بیان ہے کہ جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ بنت عمر سے فرمایا میں تجھے ایک خفیہ بات کہتا ہوں اگر تو نے کسی سے ذکر کیا تو تم پر اللہ کی لعنت اور سب فرشتوں اور لوگوں کی لعنت ہوگی! ام المؤمنین حفصہ نے کہا وہ کیا بات ہے فرمایا میرے بعد ابوبکر خلیفہ ہوں گے پھر ان کے بعد تیرا باپ عمر خلیفہ ہوگا۔ ام المؤمنین نے کہا آپ کو یہ کیسے معلوم ہے؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے علیم خبیر نے خبر دی ہے۔ باقر مجلسی نے بھی حیات القلوب میں اسے ذکر کیا ہے نیز احقاق الحق کے صـ ۱۹ پر یہی ذکر کیا کہ ابوبکر اور عمر دونوں عادل اور منصف ہیں وہ حق پر رہے اور حق پر فوت ہوئے ان دونوں پر اللہ کی رحمت ہو۔ نیز بخاری صـ ۱۰۷۲ ’’باب الاستخلاف‘‘ میں ہے۔ ایک عورت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے ارشاد فرمایا پھر آنا۔ اس نے کہا حضور اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں، اس کی مراد یہ تھی کہ آپ وفات فرما چکے ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر ہوں گے ان سے دریافت کر لینا۔ بخاری کے اسی باب میں ہے میں نے ارادہ کیا کہ ابوبکر اور ان کے بیٹے کو پیغام بھیجوں اور ان کے لئے خلافت

لکھ دوں ۔ اس حدیث کی رُو سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت بھی انہی کے لئے خلافت تحریر کرنا تھی اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ قطعاً یقین نہ تھا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے خلافت تحریر کریں گے بخاری صؔ۹۲ " باب المعانقہ " میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا میں دیکھ رہا ہوں کہ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب اسی مرض میں وفات فرما جائیں گے ، کیونکہ میں بنی عبدالمطلب کے چہروں سے ان کی موت پہچان لیتا ہوں تم میرے ساتھ چلو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیں کہ آپ کے بعد آپ کا خلیفہ کون ہوگا ، اگر خلافت ہماری ہو تو ہمیں اس کا پتہ چل جائے گا اگر کوئی اور خلیفہ ہو تو ہم لے کہہ دیں گے اس بارے میں ہم آپ سے مشورہ کریں تاکہ آپ ہمیں وصیت فرما دیں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم اگر ہم نے آپ سے خلافت کا سوال کیا اور آپ نے ہمارے لئے خلافت کا انکار کر دیا تو لوگ ہمیں کبھی خلافت نہ دیں گے ۔ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافت کے متعلق کبھی نہ پوچھوں گا ۔

معلوم ہُوا کہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے لئے خلافت کی وصیت نہ فرمائی تھی اور نہ ہی حضرت علی کو یہ معلوم تھا ، ورنہ وہ حضرت عباس کے کہنے پر ضرور فیصلہ کرا لیتے نیز مرض کے ایام میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لئے مقرر کیا تھا ان ایام میں اور کسی کو مصلیٰ پہ کھڑا ہونے کی اجازت نہ دی ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب نماز پڑھانے کے لئے عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قرأت قرأت کی آواز سُن کر فرمایا " لا ، لا ، لا " یعنی نہیں نہیں ۔

جس روز قرطاس کا واقعہ ہُوا تھا وہ جمعرات کا دن تھا اس کے چار روز بعد ہی آپ نے وفات فرمائی اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے خلافت لکھنی تھی تو ان ایام میں لکھی جاسکتی تھی ۔ بایں ہمہ کیا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کیسے حائل ہوسکتے ہیں ؟ جبکہ وہ آپ کے حضور اُونچی سانس بھی نہ لیتے تھے یہ تقریر اس تقدیر پر ہے جبکہ یہ خیال کیا جائے کہ آپ نے خلافت لکھنی تھی ممکن ہے کہ کوئی امور لکھنے کا ارادہ ہو جن کا لکھنا ضروری نہ تھا اس لئے چار روز گزر جانے کے بعد بھی کچھ نہ لکھا ۔ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں ابن عباس ان کے ساتھ تھے جبکہ وہ یہ بات کرتے ہُوئے باہر آئے تھے ۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اس حدیث شریف کو روایت کرتے وقت اُنھوں نے یہ الفاظ کہے تھے یعنی جس جگہ انھوں نے یہ حدیث بیان کی اس مکان سے یہ الفاظ کہتے ہُوئے باہر آئے اور فتنوں کے وقوع کے باعث اُنھوں نے تحدیثِ حدیث کے وقت اس تخلف کا اظہار کیا ۔ (حدالمرضی عینی ، ف ، ئی)

اسماءِ رجال

: یحییٰ بن سلیمان بن یحییٰ بن سعید جُعفی کوفی ہیں اُن کی کنیت ابوسعید ہے ۔ مصر میں سکونت پذیر تھے اور ۲۳۸ ہجری میں وہیں فوت ہُوئے ۔ ابن وہب عبداللہ کا تذکرہ حدیث ؏۹ کے اسماء میں گزرا ہے اور یونس بن یزید ابن شہاب ، عبیداللہ بن عبداللہ کا کتاب الوحی میں تذکرہ ہو چکا ہے ۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہ کر سکو گے (ابراہیم: ۳۴)

نعمۃ الباری

فی

شرح صحیح البخاری

جلد اوّل

الاحادیث : ۳۴۸ ——— ۱

کتاب بدء الوحی، کتاب الایمان، کتاب العلم

کتاب الوضوء، کتاب الغسل، کتاب الحیض، کتاب التیمم

تصنیف

علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ، کراچی-۳۸

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸- اردو بازار لاہور

١١٤ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنِي ابْنُ وَهْبٍ قَالَ أَخْبَرَنِي يُونُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ قَالَ ائْتُونِي بِكِتَابٍ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ قَالَ عُمَرُ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللَّهِ حَسْبُنَا. فَاخْتَلَفُوا وَكَثُرَ اللَّغَطُ قَالَ قُومُوا عَنِّي وَلَا يَنْبَغِي عِنْدِي التَّنَازُعُ فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُولُ إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ كِتَابِهِ. [اطراف الحدیث: ۳۰۵۳-۳۱۶۸-۴۴۳۱-۴۴۳۲-۵۶۶۹-۷۳۶۶]

(صحیح مسلم: ۲۲ ۱۶۳۷، الرقم المسلسل: ۴۱۵۴-۴۱۵۵-۴۱۵۶، السنن الکبریٰ للنسائی: ۵۸۵۲-۵۸۵۳-۵۸۵۴، مسند احمد ج ۱ ص ۳۲۵ طبع قدیم، مسند احمد: ۲۹۹۰- ج ۵ ص ۳۵)

امام بخاری روایت کرتے ہیں: ہمیں یحییٰ بن سلیمان نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا: مجھے ابن وہب نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا: مجھے یونس نے خبر دی از ابن شہاب از عبید اللہ بن عبد اللہ از حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما انہوں نے کہا: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا درد بہت زیادہ ہو گیا تو آپ نے فرمایا: میرے پاس کتاب (کاغذ) لاؤ' میں تمہارے لیے ایسا مکتوب لکھ دوں' جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس کتاب اللہ ہے' جو ہمیں کافی ہے' پھر صحابہ میں اختلاف ہوا اور کافی شور ہو گیا' آپ نے فرمایا: میرے پاس سے اٹھ جاؤ' میرے پاس اختلاف نہیں کرنا چاہیے' پھر حضرت ابن عباس یہ کہتے ہوئے باہر آئے: بے شک سب سے بڑی مصیبت وہ تھی' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لکھنے کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

اس حدیث کی باب کے عنوان کے ساتھ مطابقت ظاہر ہے' کیونکہ اس حدیث میں لکھنے کا ذکر ہے۔

مشکل الفاظ کے معانی

اس حدیث میں "اللغط" کا لفظ ہے اس کا معنی ہے: بلند آوازیں' شور۔ لیث نے کہا: اس کا معنی ہے: مبہم آوازیں' جن کا کوئی مطلب سمجھ میں نہ آئے' "الرزیة" کا معنی ہے: مصیبت۔

اس حدیث میں ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا درد بہت زیادہ ہو گیا' اس درد سے مراد ہے: مرض الموت' صحیح بخاری میں سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ یہ آپ کی وفات سے چار روز پہلے جمعرات کا دن تھا۔ (صحیح البخاری: ۳۰۵۳-۳۱۶۸)

علامہ ابن بطال مالکی کی حضرت عمر کی طرف سے توجیہات

علامہ ابو الحسن علی بن خلف بن عبد الملک ابن بطال البکری القرطبی المالکی المتوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں:

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس کاغذ قلم لاؤ' میں تمہارے لیے ایسا مکتوب لکھ دوں' جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

حضرت عمر کے اس قول سے حضرت عمر کی دین میں فقہ معلوم ہوتی ہے اور ان کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے' کیونکہ ان کو یہ خطرہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے امور لکھ دیں گے' جن پر عمل کرنے سے وہ عاجز ہوں گے اور عمل نہ کرنے کی وجہ سے پھر عذاب کے مستحق ہوں گے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے' کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ. (الانعام: ۳۸) ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ. (المائدہ: ۳) آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا۔

حضرت عمر نے جان لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کی روح اس وقت تک قبض نہیں کرے گا' جب تک آپ کے دین کو کامل نہیں کر دے گا اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ اس نے اپنی کتاب میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا اور دین کو کامل کر دیا ہے تو حضرت عمر نے ان آیتوں پر قناعت کر لی اور چونکہ نبی ﷺ کا مرض شدید تھا اور آپ پر درد کا غلبہ تھا' اس لیے انہوں نے آپ کو زحمت اور مشقت میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا' پس حضرت عمر حضرت ابن عباس سے زیادہ فقیہ تھے' کیونکہ انہوں نے اس کو کافی سمجھا کہ دین مکمل ہو چکا ہے اور حضرت ابن عباس نے دین کے کامل ہونے کو کافی نہیں سمجھا' اس لیے انہوں نے کہا کہ سب سے بڑی مصیبت وہ تھی جو آپ کے لکھنے کے درمیان حائل ہو گئی۔ (شرح ابن بطال ج ۱ ص ۱۸۰' دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۲۴ھ)

علامہ ابن بطال مالکی کی توجیہات پر مصنف کا تبصرہ

علامہ ابن بطال کی لکھی ہوئی آخری توجیہ صحیح ہے اور ان کی پہلی توجیہ صحیح نہیں ہے' جس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان کو یہ خطرہ تھا کہ نبی ﷺ ایسے امور لکھ دیں گے' جن پر عمل کرنے سے وہ عاجز ہوں گے اور عمل نہ کرنے کی وجہ سے پھر عذاب کے مستحق ہوں گے۔

حضرت عمر رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ گمان کیسے کر سکتے تھے' جب کہ ان کو معلوم تھا کہ نبی ﷺ اپنی امت پر آسانی چاہتے ہیں اور امت کا مشقت میں پڑنا آپ کو ناگوار ہے' قرآن مجید میں ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○

تمہارے پاس تمہاری جنس سے ایسے عظیم رسول آ چکے ہیں جن کو تمہارا مشقت میں پڑنا بہت گراں گزرتا ہے اور جو تمہاری آسانی پر حریص ہیں اور مومنوں پر بہت شفیق اور مہربان ہیں ○ (التوبہ: ۱۲۸)

اسی طرح احادیث میں بھی یہ تصریح ہے کہ نبی ﷺ کو اپنی امت کا مشکل کاموں میں پڑنا دشوار تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز میں مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ (صحیح البخاری: ۸۸۷' صحیح مسلم: ۲۵۲' سنن ابن ماجہ: ۲۹۰)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں کسی لشکر کے پیچھے نہ بیٹھتا۔ (صحیح البخاری: ۳۶' صحیح مسلم: ۱۸۷۶' سنن نسائی: ۵۰۲۹' سنن ابن ماجہ: ۲۷۵۳' مسند احمد ج ۲ ص ۳۹۹)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو میں ان کو حکم دیتا کہ وہ عشاء کو تہائی رات تک یا آدھی رات تک مؤخر کریں۔ (سنن ترمذی: ۱۶۷' سنن ابن ماجہ: ۶۹۱' مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ آدھی رات کو نکلے اور آپ نے مسجد میں نماز پڑھی' صحابہ نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی' صحابہ نے دوسروں سے یہ واقعہ بیان کیا تو اگلی رات بہت صحابہ جمع ہو گئے اور انہوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی' پھر انہوں نے صبح کو یہ بیان کیا تو تیسری رات بہت زیادہ اصحاب جمع ہو گئے اور انہوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی اور چوتھی رات اتنے اصحاب جمع ہو گئے کہ مسجد میں سما نہیں سکتے تھے' اس رات آپ نماز پڑھنے نہیں آئے' نماز فجر کے بعد آپ نے فرمایا: نماز کے لیے تمہارا شوق مجھ سے مخفی نہ تھا' لیکن مجھے یہ خطرہ ہوا کہ یہ نماز (تراویح) تم پر فرض کر دی جائے گی' پھر تم اس کو ادا کرنے سے عاجز ہو جاؤ گے' رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی اور تراویح کا معاملہ اسی طرح رہا۔

(صحیح البخاری: ۲۰۱۲' مسلم: ۷۶۱' سنن ابوداؤد: ۱۳۷۳' سنن نسائی: ۱۶۰۳' سنن ابن ماجہ: ۱۳۲۷)

اسی طرح اور بہت احادیث ہیں' جن سے واضح ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے آسانی چاہتے تھے اور امت پر مشقت والی عبادات کو ناپسند کرتے تھے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیسے یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے ایسے پُرمشقت کام لکھ دیں گے' جن کے ادا کرنے سے وہ عاجز ہوں گے۔

علامہ ابن جوزی حنبلی کی حضرت عمر کی طرف سے توجیہات

علامہ عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا لکھ کر دینا چاہتے تھے' ایک قول یہ ہے کہ آپ یہ تصریح کرنا چاہتے تھے کہ آپ کے بعد خلیفہ کون ہو گا' اور دوسرا قول یہ ہے کہ آپ ان کو ایسے احکام لکھ کر دینا چاہتے تھے' جن کی وجہ سے کوئی اختلاف نہ رہتا' لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔

حضرت عمر نے کہا: ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے جو ہمیں کافی ہے۔ علامہ خطابی نے اس کی وضاحت میں کہا: حضرت عمر نے یہ اس لیے کہا تھا کہ اگر آپ نے کسی ایسی چیز کی تصریح کر دی' جس سے اختلاف زائل ہو جائے تو پھر علماء کی فضیلت نہیں رہے گی اور اجتہاد نہیں ہو سکے گا۔ علامہ خطابی کی یہ وضاحت دو وجہوں سے غلط ہے: (۱) ایک تو اس لیے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت عمر کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے بہتر تھی اور ایسا کہنا بداہۃً باطل ہے (۲) دوسرا اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی ایک چیز یا چند چیزوں کا تعین کر دیتے تو اس سے اجتہاد باطل نہیں ہوتا کیونکہ حوادث اتنے زیادہ ہیں ان کا حصر نہیں کیا جا سکتا' بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خطرہ تھا کہ آپ پر مرض کا غلبہ ہے' کہیں آپ اس حالت میں کوئی ایسی بات نہ لکھوا دیں' جو عقل کے خلاف ہو اور اگر صحابہ کو یہ یقین ہوتا کہ آپ کو افاقہ ہے تو وہ سب آپ کے حکم کی تعمیل میں سبقت کرتے' اس پر قرینہ یہ ہے کہ بعض روایات میں ہے:

''اتراہ یھجر'' ''کیا تمہارے خیال میں آپ بے ربط باتیں کر رہے ہیں؟ یعنی جس طرح مریض غلبۂ مرض کی وجہ سے بے تکی اور اول فول باتیں کرتا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے' یعنی آپ کا کلام بے ربط اور بے معنی نہیں ہے۔

(کشف المشکل ج ۱ ص ۱۱۵' دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۲۴ھ)

علامہ ابن جوزی حنبلی کی توجیہات پر مصنف کا تبصرہ

علامہ ابن جوزی نے جو حضرت عمر کی طرف سے یہ توجیہ کی ہے کہ حضرت عمر کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں آپ بیماری کے حال میں ایسی بات نہ لکھ دیں' جو خلاف عقل ہو' یہ توجیہ علامہ خطابی کی توجیہ سے بھی زیادہ بعید ہے' حضرت عمر نے جو کہا تھا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے' انہوں نے اس قول سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا تھا اور نہ ان کو یہ خطرہ تھا کہ آپ بیماری کے حال میں کوئی خلاف عقل یا غلط بات لکھ دیں گے' بلکہ وہ آپ کو اس تکلیف میں لکھنے کی مشقت سے بچانا چاہتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ آپ کا یہ حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ بہ طور استحباب ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آپ نے کاغذ قلم منگوانے پر اصرار نہیں کیا اور اس کے بعد آپ چار دن تک ظاہراً حیات رہے مگر آپ نے دوبارہ کاغذ اور قلم لانے کا حکم نہیں دیا' اور چونکہ آپ نے حضرت عمر کے قول کا رد نہیں فرمایا' اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک حضرت عمر کا قول صحیح تھا۔

''اَھْجَرَ'' کی تحقیق

علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ بعض روایات میں ''اَھْجَرَ'' کے الفاظ ہیں' وہ حدیث یہ ہے:

حضرت ابن عباس نے کہا کہ جمعرات کا دن اور کیسا (اندوہ ناک) تھا جمعرات کے دن' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد بہت سخت ہو

کیا آپ نے فرمایا: مجھے (کاغذ قلم) لا کر دو! میں تمہیں ایسا مکتوب لکھ دوں' جس کے بعد تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے' پھر صحابہ میں اختلاف ہو گیا اور نبی کے پاس اختلاف نہیں کرنا چاہیے' صحابہ نے کہا: آپ کا کیا حال ہے؟ "اَھَجَرَ" کیا آپ بے ربط باتیں کر رہے ہیں' آپ سے پوچھ لو' پھر صحابہ آپ کی طرف لوٹنے لگے' آپ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو! میں جس حال میں ہوں' وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو! اور آپ نے ان کو تین چیزوں کی وصیت کی: (۱) مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو (۲) جو وفد تمہارے پاس آئے' اس کو اسی طرح انعام دو' جس طرح میں ان کو انعام دیتا تھا' راوی نے کہا: تیسری وصیت کو میں بھول گیا۔

(صحیح البخاری: ۳۰۵۳' صحیح مسلم: ۱۶۳۷)

یہ لفظ اگر "هُجُر" ہو تو اس کا معنی هذیان ہے اور اگر "هَجَر" ہو تو اس کا معنی ہجرت کرنا اور جدا ہونا ہے۔ (مختار الصحاح ص ۳۹۷)

اس حدیث میں "هُجُر" نہیں ہو سکتا' ورنہ اس کا معنی ہوگا: کیا آپ ہذیان کہہ رہے ہیں اور بے تکی باتیں کر رہے ہیں' آپ سے پوچھ لو اور جو شخص ہذیان کر رہا ہو اس سے یہ پوچھنے کا کوئی معقول معنی نہیں ہے کہ کیا تم ہذیان کر رہے ہو؟ اور بے تکی باتیں کر رہے ہو؟

"هُجر" کا معنی ہذیان ہے' جب اس کے مصدر میں ہا پر زبر ہو یعنی بیماری میں انسان جو بے ربط' بے فائدہ اور مہمل باتیں کرتا ہے اور اس کا وقوع نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محال ہے' آپ سے صحت میں ہذیان ممکن ہے نہ مرض میں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ (النجم: ۳) — آپ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے ۝

نیز آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے! اس منہ سے حق کے سوا اور کوئی بات نہیں نکلتی۔

(سنن ابوداؤد: ۳۶۴۶)

سو جس صحابی نے یہ کہا: اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کو کاغذ قلم لا کر دو' آپ کوئی ہذیان تو نہیں کہہ رہے' آپ حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتے۔

"هَجر" کا دوسرا معنی ہے: ہجرت کرنا' الوداع ہونا' جب اس کے مصدر میں ھا کے نیچے زیر ہو یعنی کیا آپ زندگی سے الوداع ہو رہے ہیں اور آخری وقت میں وصیت کر رہے ہیں' آپ سے پوچھ لو اور اس حدیث کے آخر میں ہے: آپ نے تین وصیتیں فرمائیں' یہ اس معنی کی تائید کرتا ہے کہ "هجر" کا معنی یہاں ہذیان نہیں ہے بلکہ ہجرت کرنا ہے اور آپ نے جو وصیتیں فرمائیں' وہ بالکل صحیح اور معقول تھیں اور اس سے ان لوگوں کا رد ہو جاتا ہے' جنہوں نے یہ کہا کہ حضرت عمر کو یہ خطرہ تھا کہ آپ بیماری کے حال میں کوئی خلاف عقل بات کہہ دیں گے' حضرت عمر آپ کے متعلق ایسی بات کب سوچ سکتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس الزام کا جواب کہ آپ کے تمام اقوال وحی کے موافق نہ تھے

بعض مشائخ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اعتراض دور کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو غیر محفوظ قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ آپ غلط بات کہہ سکتے تھے' اس لیے حضرت عمر نے آپ کو کاغذ قلم دینے سے منع کیا' انہوں نے کہا: آں حضرت کے تمام منطوقات اور مقولات یعنی اقوال و گفتار وحی کے مطابق نہ تھے' آیت کریمہ "وما ینطق عن الھوی" نص قرآنی سے مخصوص ہے' جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مفسرین میں سے محققین نے لکھا ہے کہ آپ کا ہر قول وحی کے موافق تھا' امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ ھ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: اللہ تعالیٰ جس کو رسول بنانے کا ارادہ کرتا ہے' اس کو بچپن میں کفر سے اور برے کاموں مثلاً چوری' زنا اور جھوٹ سے محفوظ رکھتا ہے' پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ اپنے بچپن میں گم راہ نہیں ہوئے کیونکہ وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے'

تھے۔ (تفسیر کبیر ج ۱۰ ص ۲۳۴' دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

نیز یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ سنت بھی عمل میں وحی منزل کی طرح ہے اور اس تفسیر کے مقدمہ میں حضرت مقدام بن معدی کرب کی حدیث گزر چکی ہے' والحمد للہ۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۷ ص ۷۹' دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

علامہ قرطبی نے حضرت مقدام بن معدی کرب کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے' وہ یہ ہے:

حضرت المقدام بن معدی کرب الکندی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن پالتو گدھے اور کئی چیزوں کو حرام کر دیا' پھر فرمایا: عنقریب ایک شخص اپنے تخت پر ٹیک لگائے ہوئے میری حدیث بیان کر کے کہے گا: ہمارے اور تمہارے درمیان صرف کتاب اللہ ہے' ہم اس میں جو حلال پائیں' وہ حلال ہے اور ہم جو اس میں حرام پائیں' وہ حرام ہے' سنو! جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے' وہ بھی اسی کی مثل حرام ہے' جس کو اللہ عزوجل نے حرام کیا ہے۔ (سنن دارمی: ۵۹۰' دار المعرفہ بیروت' ۱۴۲۱ھ)

علامہ قرطبی مالکی کی اس تفسیر سے واضح ہو گیا کہ ان کے نزدیک "وما ینطق عن الھوی" صرف قرآن مجید کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ آپ کے تمام اقوال کو شامل ہے۔

قاضی عبد اللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آپ سے قرآن کا جو نطق صادر ہوتا ہے' یا آپ جو بھی نطق کرتے ہیں' وہ صرف اللہ کی' کی ہوئی وحی سے ہے' جو علماء آپ کے لیے اجتہاد کو جائز نہیں کہتے' انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ پر وحی کی گئی کہ آپ اجتہاد کریں تو جو حکم آپ کے اجتہاد سے حاصل ہوگا' وہ بھی وحی ہوگا' اس پر یہ اعتراض ہے کہ وہ حکم وحی سے حاصل ہوگا' وحی نہیں ہوگا۔

(تفسیر البیضاوی مع حاشیۃ شیخ زادہ ج ۸ ص ۵' دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۹ھ)

آپ کے ہر کلام کے برحق ہونے کے ثبوت میں احادیث

نیز احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آپ کا ہر کلام حق ہوتا تھا:

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس منہ سے حق کے سوا اور کوئی بات نہیں نکلتی۔ (سنن ابوداؤد: ۳۶۴۶' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹ ص ۴۹' المستدرک ج ۱ ص ۱۰۵' سنن دارمی: ۴۸۹' مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا' آپ کے بعض اصحاب نے کہا: یا رسول اللہ! آپ ہم سے مذاق (بھی تو) کرتے ہیں' آپ نے فرمایا: میں حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا۔ (شعیب الارنؤوط نے کہا: اس حدیث کی سند محمد بن عجلان کی وجہ سے قوی ہے اور اس کے باقی رجال ثقہ ہیں' شیخین کے رجال ہیں۔)

(مسند احمد ج ۲ ص ۳۴۰ طبع قدیم' مسند احمد: ۸۴۸۱۔ ج ۱۴ ص ۱۸۵' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۸' الادب المفرد للبخاری: ۲۶۵' المعجم الاوسط: ۹۱۴)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جبریل امین نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سنت بھی اس طرح نازل کرتے تھے' جس طرح قرآن نازل کرتے تھے۔ (سنن دارمی: ۵۹۲' دار المعرفہ بیروت' ۱۴۲۱ھ)

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی تو ایک شخص نے کہا: کتاب اللہ میں اس کے خلاف ہے' انہوں نے کہا: کیا میں تمہیں دیکھ رہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم اس پر کتاب اللہ سے معارضہ کر رہے ہو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کو تم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ (سنن دارمی: ۵۹۳)

"عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ" سے معارضہ کا جواب

اسی طرح ان بعض مشائخ نے یہ معارضہ کیا ہے کہ اگر آں حضرت کے تمام اقوال و گفتار وحی کے موافق ہوتے تو حق تعالیٰ کی طرف سے بعض اقوال پر اعتراض وارد نہ ہوتا اور ان سے معافی کی گنجائش نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ. (التوبہ: ۴۳) اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے ان منافقین کو (غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کی) اجازت کیوں دی۔

میں کہتا ہوں: اگر اللہ نے پہلے آپ کو منافقین کو اجازت دینے سے لازماً منع کیا ہوتا تو آپ کا ان کو اجازت دینا فعل حرام اور گناہ کبیرہ ہوتا اور اگر ترجیحاً منع کیا ہوتا تو پھر آپ کا اجازت دینا خلاف اولیٰ اور مکروہ تنزیہی ہوتا' لیکن جب اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کو اس سے منع کیا ہی نہیں تو پھر آپ کا منافقین کو غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے کی اجازت دینا' کسی قسم کا گناہ ہے نہ یہ فعل مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ ہے' بلکہ آپ کے لیے ان کو اجازت دینا یا نہ دینا دونوں فعل مباح تھے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے محبت آمیز خطاب فرمایا ہے کہ اللہ آپ کو معاف فرمائے' آپ نے ان کو جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت کیوں دے دی' حالانکہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو یہ پھر بھی جہاد میں شامل ہونے والے نہ تھے' یعنی ان کے حق میں آپ کا اجازت دینا اور نہ دینا دونوں برابر تھے۔

(تبیان القرآن ج ۵ ص ۱۳۸۔ ۱۳۷ 'التوبہ: ۴۳ 'فرید بک سٹال لاہور' ۱۴۳۱ھ)

علاوہ ازیں میں یہ کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (الاعراف: ۲۰۳) آپ کہیے: میں صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں' جس کی میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ. (الانعام: ۵۰' یونس: ۱۵) میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں' جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

لہٰذا آپ کا منافقین کو اجازت دینا بھی وحی کی بنیاد پر تھا اور یہ وحی خفی تھی' قرآن مجید نے حصر کر دیا ہے کہ آپ کا ہر قول وحی کے موافق ہے اور آپ کا ہر فعل وحی کے موافق ہے' نمازوں میں جو آپ کو سہو ہوئے' وہ بھی وحی خفی کے موافق تھے تاکہ امت کے لیے ان کے سہو میں اسوہ اور نمونہ ہو جائے اور آپ کو جو نسیان ہوا' وہ بھی وحی خفی کے موافق تھا' جیسا کہ حدیث میں ہے:

امام مالک نے فرمایا: مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ کوئی فعل سنت ہو جائے۔ (موطا امام مالک' کتاب السہو' حدیث: ۲' دارالمعرفہ بیروت' ۱۴۲۰ھ)

بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کی وجہ سے آپ کی خطا ثابت کرنا اور اس کا جواب

بدر کے قیدیوں سے آپ کا فدیہ لینا بھی اتباع وحی میں تھا اور فدیہ لینے میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر عتاب نہیں فرمایا' بلکہ ان بعض مسلم صحابہ پر عتاب فرمایا' جنہوں نے مال دنیا کی طمع میں فدیہ لینے کی رائے کو ترجیح دی تھی رہے آپ تو آپ نے فدیہ لینے کو اس لیے ترجیح دی تھی کہ آپ کو علم تھا کہ ان قیدیوں میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو جائیں گے' سو آپ نے ان کے اسلام کی وجہ سے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کی رائے کو پسند کیا تھا۔

※ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کی تحقیق الانفال: ۶۸۔ ۶۷ کی تفسیر میں تبیان القرآن ج ۴ ص ۶۹۷۔ ۶۹۲ میں مطالعہ فرمائیں۔

اس علمی بحث کے بعد ہم اب پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کر رہے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس وجہ سے کاغذ اور قلم

لانے سے منع کیا تھا۔

حافظ عسقلانی کی طرف سے حضرت عمر کی توجیہات اور اس کا بیان کہ رسول اللہ ﷺ کیا لکھنا چاہتے تھے

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا تھا کہ آپ کے لیے از خود لکھنا یا لکھوانا' دشواری اور مشقت کا باعث ہوگا' لہٰذا آپ کو اس کی زحمت نہ دی جائے' علامہ قرطبی وغیرہ نے کہا ہے: آپ نے فرمایا: میرے پاس کاغذ اور قلم لاؤ' یہ آپ کا حکم تھا اور حکم کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے' لیکن حضرت عمر کی دوسرے اصحاب کے ساتھ رائے یہ تھی کہ یہ حکم وجوب کے لیے نہیں ہے' بلکہ آپ نے زیادہ بہتر کام کی طرف متوجہ فرمایا ہے' لہٰذا ان اصحاب نے آپ کو اس حالت میں اس مشقت میں ڈالنے کو ناپسند کیا اور جب کہ ان کے ذہنوں میں قرآن مجید کی یہ آیات بھی تھیں:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ. (الانعام:۳۸) ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ. (النحل:۸۹) قرآن مجید ہر چیز کو بیان کرنے والا ہے۔

اس لیے حضرت عمر نے کہا: ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

صحابہ کی دوسری جماعت کی رائے یہ تھی کہ افضل یہ ہے کہ آپ کو لکھنے دیا جائے' کیونکہ اس طرح آپ کے حکم پر عمل ہوگا اور چونکہ آپ نے بعد میں سب کو وہاں سے اٹھنے کا حکم دیا' اس سے واضح ہو گیا کہ آپ کا پہلا حکم اختیاری تھا' واجبی نہ تھا' یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد آپ کئی روز تک زندہ رہے' لیکن آپ نے دوبارہ کاغذ اور قلم لانے کا حکم نہیں دیا' اگر آپ کا یہ حکم واجبی ہوتا تو صحابہ کے اختلاف کی وجہ سے آپ اپنے حکم کو ترک نہ فرماتے' کیونکہ آپ نے کفار کی شدید مخالفت کے باوجود تبلیغ کو ترک نہیں فرمایا' اور صحابہ بعض کاموں میں آپ سے اختلاف کرتے تھے' لیکن جب آپ کسی کام کا عزم فرما لیتے تو پھر آپ کے حکم پر عمل کرتے تھے' ان شاء اللہ اس کو ہم بسط اور تفصیل سے ''کتاب الاعتصام'' میں لکھیں گے (حافظ ابن حجر ''کتاب الاعتصام'' میں تفصیل سے لکھنا بھول گئے' وہاں صرف دو سطریں لکھی ہیں' دیکھئے فتح الباری ج ۸ ص ۳۸۴' دار المعرفۃ' بیروت' ۱۴۲۶ھ) حضرت عمر کے اس قول کو ان کی موافقات میں سے شمار کیا گیا ہے۔

نبی ﷺ کیا لکھنا چاہتے تھے' اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ ایسی تحریر لکھنا چاہتے تھے' جس میں احکام کی صاف تصریح کر دی جاتی اور اختلاف نہ رہتا' دوسرا قول یہ ہے کہ آپ اپنے بعد ہونے والے خلفاء کے نام لکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کے درمیان اختلاف نہ ہوتا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آپ جب اپنے مرض کی ابتداء میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے تو آپ نے ان سے فرمایا' حدیث میں ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے مرض میں مجھ سے فرمایا: میرے لیے ابوبکر کو اور اپنے بھائی کو بلاؤ حتیٰ کہ میں ایک مکتوب لکھ دوں کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کوئی کہنے والا کہے گا کہ میں زیادہ مستحق ہوں اور اللہ اور مومنین ابوبکر کے غیر کا انکار کر دیں گے۔ (صحیح البخاری: ۵۶۶۶-۷۲۱۷' صحیح مسلم: ۲۳۸۷' طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۱۸۰' السنن الکبریٰ للنسائی: ۷۰۸۱' صحیح ابن حبان: ۶۵۹۸' سنن بیہقی ج ۸ ص ۱۵۳' دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۳۴۳' حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۸۵' المعجم الاوسط: ۳۵۱۴' مسند احمد ج ۶ ص ۱۴۴ طبع قدیم' مسند احمد: ۲۵۱۱۳- ج ۴۲ ص ۵۰)

اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لکھا نہیں اور پہلا قول زیادہ ظاہر ہے' کیونکہ حضرت عمر نے کہا: ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس سے اٹھ جاؤ اور میرے پاس اختلاف کرنا نہیں چاہیے۔
آپ کے اس ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحابی کے لیے اولیٰ یہ تھا کہ وہ آپ کے حکم پر عمل کرتے' اگرچہ حضرت عمر کی اختیار کی ہوئی تاویل صحیح تھی' کیونکہ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم پر عمل کرنے کے لیے نہیں فرمایا' علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ صحابہ کے اس اختلاف کی نظیر یہ ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: تم میں سے کوئی شخص بنی قریظہ میں پہنچے بغیر نماز نہ پڑھے۔

(صحیح البخاری: ۹۴۶' صحیح مسلم: ۱۷۷۰)

بعض صحابہ نے کہا: اگر ہم نے بنو قریظہ میں پہنچ کر نماز پڑھی تو وقت نکل جائے گا اور آپ کا منشاء یہ نہیں تھا کہ ضرور بنی قریظہ میں عصر پڑھنا' سو انہوں نے راستہ میں نماز پڑھ لی اور بعض نے اس حکم کے ظاہر پر عمل کیا اور بنو قریظہ پہنچ کر نماز پڑھی اور آپ نے کسی فریق کو ملامت نہیں کیا۔ (فتح الباری ج ا ص ۲۵۹ـ ۲۵۸' دار المعرفہ بیروت' ۱۴۲۶ھ)

مصنف کی طرف سے حضرت عمر پر شیعہ علماء کے اعتراض کے جوابات اور دیگر مسائل

شیعہ علماء نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ اور قلم لانے کے لیے کہا تو حضرت عمر نے یہ جواب دیا کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے' ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی ایسا ہی اعتراض ہوتا ہے' حدیث میں ہے:
حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور حضرت فاطمہ بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا: تم دونوں نماز نہیں پڑھتے' میں نے کہا: یا رسول اللہ! ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں' پس جب وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو ہم اٹھ جاتے ہیں' جب ہم نے یہ کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس چلے گئے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا' پھر میں نے سنا آپ پیٹھ موڑ کر اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے جا رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے:

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا. (الکہف: ۵۴) اور انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

(صحیح البخاری: ۷۳۴۷' صحیح مسلم: ۷۷۵' سنن نسائی: ۱۶۱۱' مسند احمد ج ا ص ۹۱' مسند احمد: ۷۰۵' ج ۲ ص ۱۱۲)

اور اس کے علاوہ یہ حدیث ہے:
حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کو طبق (بڑی پلیٹ) لا کر دوں' آپ اس میں ایسی چیزیں لکھ دیں' جس کے بعد آپ کی امت گم راہ نہیں ہوگی' حضرت علی نے کہا: مجھے یہ خطرہ ہوا کہ شاید آپ کی روح قبض ہو جائے' میں نے کہا: میں یاد رکھوں گا اور محفوظ رکھوں گا (یعنی طبق لا کر نہیں دیا)' آپ نے فرمایا: میں نماز کی' زکوٰۃ کی اور تمہاری باندیوں کے معاملہ میں وصیت کرتا ہوں۔ (مسند احمد ج ا ص ۹۰' طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۴۳' الادب المفرد للبخاری: ۱۵۶)
پہلی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تہجد کے لیے اٹھانے گئے تو حضرت علی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پلٹ کر ایسا جواب دیا' جس سے آپ کو سخت افسوس ہوا اور دوسری حدیث میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کے لیے طبق منگایا اور حضرت علی نے لا کر نہیں دیا اور کہا: میں یاد کر لوں گا' علماء شیعہ ان حدیثوں کا جواب دیں۔
حضرت عمر کی طرف سے توجیہ یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی فیصلہ فرماتے اور صحابہ کو اس میں تردد ہوتا تو وہ آپ کے سامنے اپنی رائے اور اپنے اختلاف کو ظاہر کرتے اور جب وہ دیکھتے کہ اس فیصلہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جزم اور یقین ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شبہات کو دلائل سے رد فرما دیا ہے تو پھر وہ آپ کے فیصلہ کو تسلیم کر لیتے اور آپ کے حکم پر عمل کرتے' جیسے مشرکین کے ساتھ حدیبیہ میں

جن شرائط پر صلح ہوئی تھی' حضرت عمر اور دیگر صحابہ کو ان شرائط سے اختلاف تھا' لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شبہات کا جواب دے دیا تو وہ مطمئن ہو گئے اور صلح کی ان شرائط کو مان لیا' اسی طرح جب آپ نے عبد اللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے کا فیصلہ کیا تو حضرت عمر کو اس سے اختلاف تھا' لیکن جب آپ نے ان کے شبہات کا جواب دے دیا تو حضرت عمر نے آپ کے اس فیصلہ کو مان لیا' لیکن مرض الموت کے اس موقع پر جب آپ نے کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا اور اس پر حضرت عمر نے اپنا یہ شبہ پیش کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے' جو ہمیں کافی ہے تو آپ نے حضرت عمر کے اس قول کو رد نہیں فرمایا اور کاغذ اور قلم منگوانے پر اصرار نہیں فرمایا' اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول صحیح اور صائب تھا' ورنہ آپ کسی کے اختلاف کی وجہ سے حق بات کو کبھی بھی ترک نہیں فرماتے تھے۔

آپ نے جو کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا تھا' اس سے معلوم ہوا کہ امام اور سربراہ ملک عوام کی مصلحت کی وجہ سے موت کے وقت ان کے لیے کوئی وصیت کر سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ آپ حضرت ابوبکر کی خلافت کے متعلق لکھوانا چاہتے ہوں' جیسا کہ صحیح مسلم: ۲۳۸۷ اور صحیح بخاری: ۵۶۶۶ میں ہے' لیکن آپ نے اس کو اس لیے ترک کر دیا کہ آپ مختلف قرائن سے اس امر کا اظہار کر چکے ہیں' مثلاً آپ نے نمازوں میں حضرت ابوبکر کو امام بنایا اور کسی اور کو امام بنانے پر راضی نہیں ہوئے اور حضرت ابوبکر کی امارت میں مسلمانوں کو حج کے لیے بھیجا' سفر ہجرت میں اپنی رفاقت کے لیے حضرت ابوبکر کو منتخب کیا' سو آپ چاہتے تھے کہ مسلمان ان قرائن میں غور و فکر کر کے از خود اپنے اجتہاد اور اپنے انتخاب سے میرے بعد حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنائیں۔

اس حدیث میں علم کی باتوں کو لکھنے کا ثبوت ہے اور یہی اس باب کا عنوان ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کا ثبوت ہے' کیونکہ آپ نے فرمایا: کاغذ اور قلم لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسا مکتوب لکھ دوں' جس کے بعد تم کبھی گم راہ نہیں ہو گے' اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا اُمی ہونا' آپ کے لکھنے اور پڑھنے کے منافی نہیں ہے۔

شرح صحیح مسلم میں باب مذکور کی حدیث کی شرح

باب مذکور کی حدیث شرح صحیح مسلم: ۴۱۹۹- ج ۴ ص ۵۱۷ پر مذکور ہے اور اس کی شرح میں حسب ذیل عنوانات ہیں:

(۱) اھجر کی تحقیق (۲) حدیث قرطاس میں حضرت عمر پر حضور کا کہنا نہ ماننے کا اعتراض اور اس کے جوابات (۳) کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کی خلافت کے بارے میں کچھ لکھوانا چاہتے تھے۔

۴۰- بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ — رات کو علم کی بات اور نصیحت کرنا

اس باب کی باب سابق کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ باب سابق میں علم کی باتوں کو لکھنے کا بیان تھا' جو علم کو منضبط کرنے اور اس میں کوشش کرنے پر دلالت کرتا ہے اور یہ باب رات کو علم کی تعلیم اور تعلم پر دلالت کرتا ہے اور اس کے لیے بھی منضبط کرنے اور کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۱۵- حَدَّثَنَا صَدَقَةُ قَالَ أَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ' عَنْ مَعْمَرٍ' عَنِ الزُّهْرِيِّ' عَنْ هِنْدٍ' عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ' وَعَمْرٍو وَيَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ' عَنِ الزُّهْرِيِّ' عَنْ هِنْدٍ' عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ

امام بخاری روایت کرتے ہیں: ہمیں صدقہ نے حدیث بیان کی' وہ کہتے ہیں: ہمیں ابن عیینہ نے خبر دی از معمر از زہری از ہند از ام سلمہ و عمرو و یحییٰ بن سعید از زہری از ہند از ام سلمہ رضی اللہ عنہا' وہ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ نے

فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ، وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ، أَيْقِظُوا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ، فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ.

فرمایا: سبحان اللہ! آج رات کیا کیا فتنے نازل کیے گئے ہیں! اور کیا کیا خزانے کھولے گئے ہیں، حجروں والیوں کو بیدار کرو، بہت سی عورتیں جو دنیا میں ملبوس ہوتی ہیں آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

[اطراف الحدیث: ۱۱۲۶-۳۵۹۹-۵۸۴۴-۶۲۱۸-۷۰۶۹] [سنن ترمذی: ۲۱۹۶، مصنف عبد الرزاق: ۲۰۷۴۸، المعجم الکبیر ج ۲۳ ص ۸۳، شعب الایمان: ۱۰۳۸۹، مسند ابو یعلیٰ: ۶۹۸۸، المعجم الاوسط: ۹۲۰۰، مسند الشامیین: ۳۲۲۵، شرح السنۃ: ۹۳۱، مسند الحمیدی: ۲۹۴، صحیح ابن حبان: ۶۹۱، مسند احمد ج ۶ ص ۲۹۷ طبع قدیم، مسند احمد: ۲۶۵۴۴، ج ۴۴ ص ۱۶۷، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت]

اس باب کے عنوان میں دو امور ذکر کیے گئے ہیں: (۱) علم اور نصیحت کرنا۔ اس کی مطابقت حدیث کے اس جملہ میں ہے: آج رات کیا کیا فتنے نازل کیے گئے ہیں (۲) رات کو نصیحت کرنا۔ اس کی مطابقت حدیث کے اس جملہ میں ہے: حجروں والیوں کو بیدار کرو۔

حدیث مذکور کے رجال کا تعارف اور حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ

(۱) صدقہ بن فضل المروزی ابو الفضل ائمہ ستہ میں سے صرف امام بخاری نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، یہ حافظ اور امام تھے، ۲۲۳ھ میں فوت ہو گئے تھے (۲) سفیان بن عیینہ (۳) معمر بن راشد (۴) محمد بن مسلم الزہری (۵) عمرو بن دینار (۶) یحییٰ بن سعید انصاری ان سب کا تعارف ہو چکا ہے (۷) ہند بنت الحارث الفراسیہ، یہ معبد بن المقداد کی زوجہ تھیں، امام مسلم کے علاوہ باقی ائمہ ستہ نے ان سے روایت کی ہے (۸) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان کا نام ہند ہے، ایک قول ہے: ان کا نام رملہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ اور ابو امیہ حذیفہ کی بیٹی ہیں، یہ پہلے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، وہ فوت ہو گئے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ۳۷۸ احادیث روایت کی ہیں، امام بخاری اور امام مسلم ان سے ۱۳ احادیث پر متفق ہیں، انہوں نے حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت کی ہے، ابو سلمہ کے نکاح میں ان سے زینب پیدا ہوئیں، پھر ان کے بعد سلمہ، عمر اور درہ کی ولادت ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال ۴ھ میں ان سے نکاح کیا، یہ ۵۹ھ میں فوت ہو گئیں، وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال تھی، حضرت ابو ہریرہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، البقیع میں ان کو دفن کیا گیا، ان سے بہت بڑی جماعت نے احادیث روایت کی ہیں۔

(عمدۃ القاری ج ۲ ص ۲۶۰)

اس امت میں واقع ہونے والے بعض فتنے

اس حدیث میں فرمایا ہے: آج رات کیا کیا فتنے نازل کیے گئے ہیں اور کیا کیا خزانے کھولے گئے ہیں! اس کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات خواب دیکھا اور اس میں آپ نے وہ فتنے دیکھے، جو آپ کے بعد واقع ہوں گے اور آپ نے وہ خزانے دیکھے، جو آپ کی امت کے لیے کھولے جائیں گے اور بیدار ہونے کے بعد آپ پر اس کی حقیقت منکشف ہوئی، آپ کے بعد جو فتنے ہوئے وہ مشہور ہیں، جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل، جنگ جمل اور جنگ صفین اور جنگ نہروان، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی شہادت، اس کے بعد کعبہ کو جلایا جانا اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت، اس کے بعد ۳۱۹ھ میں قرامطہ کعبہ پر حملہ آور ہوئے اور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے، جو ۲۲ سال تک ان کے پاس رہا، اور انہوں نے بہ کثرت حجاج کو شہید کیا، ۶۳۳ھ میں تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا اور لاکھوں مسلمانوں کو شہید کر دیا، اس کے بعد اب تک مسلمان فتنوں کی زد میں ہیں۔

نیز اس حدیث میں فرمایا: حجروں والیوں کو جگاؤ، اس سے مراد ازواج مطہرات ہیں، نیز اس میں فرمایا: جو دنیا میں ملبوس ہوں گی وہ آخرت میں برہنہ ہوں گی، اس کا معنی یہ ہے کہ جو دکھاوے کے اعمال کریں گی وہ آخرت میں بے عمل ہوں گی۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہ کر سکو گے (ابراہیم: ۳۴)

نعمۃ الباری

فی

شرح صحیح البخاری

جلد ہفتم

الاحادیث: ۳۶۲۶ —— ۳۸۵۱

کتاب مناقب الانصار، کتاب المغازی، کتاب تفسیر القرآن

تصنیف

علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث، دار العلوم نعیمیہ، کراچی۔ ۳۸

ناشر

فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور

فَقَالَ لَهُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ إِنَّ لَنَا أَبْنَاءً مِثْلَهُ فَقَالَ إِنَّهُ مِنْ حَيْثُ تَعْلَمُ فَسَأَلَ عُمَرُ ابْنَ عَبَّاسٍ عَنْ هٰذِهِ الْآيَةِ ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝﴾ (النصر:١) فَقَالَ أَجَلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْلَمَهُ إِيَّاهُ فَقَالَ مَا أَعْلَمُ مِنْهَا إِلَّا مَا تَعْلَمُ.

رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو قریب رکھتے تھے تو ان سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے تو بیٹے ان جیسے ہیں، حضرت عمر نے کہا: (اس کا قرب) اس کے علم کی حیثیت سے ہے پس حضرت عمر نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کے متعلق سوال کیا: جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے گی ۝ (النصر:١) تو حضرت ابن عباس نے بتایا: اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجل کا بیان ہے یہ آپ نے اُن کو خبر دی تھی، حضرت عمر نے کہا: میں اس آیت کے متعلق اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ تم جانتے ہو۔

اس حدیث کی شرح صحیح البخاری: ٣٦٢٧ میں گزر چکی ہے۔

٤٤٣١- حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ سُلَيْمَانَ الْأَحْوَلِ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَوْمُ الْخَمِيْسِ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيْسِ اشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ فَقَالَ ائْتُوْنِيْ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ أَبَدًا فَتَنَازَعُوْا وَلَا يَنْبَغِيْ عِنْدَ نَبِيٍّ تَنَازُعٌ فَقَالُوْا مَا شَأْنُهُ أَهَجَرَ اسْتَفْهِمُوْهُ فَذَهَبُوْا يَرُدُّوْنَ عَلَيْهِ فَقَالَ دَعُوْنِيْ فَالَّذِيْ أَنَا فِيْهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُوْنِيْ إِلَيْهِ وَأَوْصَاهُمْ بِثَلَاثٍ قَالَ أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَأَجِيْزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ أُجِيْزُهُمْ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ أَوْ قَالَ فَنَسِيْتُهَا.

امام بخاری روایت کرتے ہیں: ہمیں قتیبہ نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا: ہمیں سفیان نے حدیث بیان کی از سلیمان الاحول از سعید بن جبیر، وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جمعرات کا دن، وہ کیسا تھا جمعرات کا دن اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد زیادہ ہو گیا، آپ نے فرمایا: میرے پاس کوئی چیز لاؤ تا کہ میں تمہارے لیے ایسا مکتوب لکھ دوں، جس کے بعد تم کبھی بھی گم راہ نہیں ہو گے، پس صحابہ بحث کرنے لگے اور نبی کے پاس بحث کرنی نہیں چاہیے، انہوں نے کہا: آپ کا کیا حال ہے؟ کیا آپ بیماری کی وجہ سے بے معنی کلام کر رہے ہیں؟ آپ سے پوچھ لو پس صحابہ آپ کی بات کا جواب دینے لگے آپ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو میں جس حال میں میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو اور آپ نے ان کو تین چیزوں کی وصیت کی، آپ نے فرمایا: مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور وفد کو اسی طرح انعام دینا جس طرح میں انہیں انعام دیتا تھا اور آپ تیسری وصیت کرنے سے خاموش رہے یا راوی نے کہا: میں اس کو بھول گیا۔

اس حدیث کی شرح صحیح البخاری: ١١٤ میں گزر چکی ہے، تاہم چند ضروری اُمور بیان کیے جا رہے ہیں:

"اھجر" کی تحقیق، صحابہ کے اختلاف کی توجیہ، حضرت عمر نے جو کہا تھا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔۔۔

اس کی متعدد توجیہات، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا: مجھے چھوڑ دو! میں جس حال میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے

اس ارشاد کی تقریرات، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تیسری وصیت بیان نہیں کی، اس کے متعلق شارحین کی آراء

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ٨٥٢ھ لکھتے ہیں:

''اھجر'' کا معنی ہے: جب کوئی مریض بیماری کے غلبہ میں ایسی باتیں کرتا ہے جو مہمل' بے فائدہ اور ناقابلِ شمار ہوں' کیونکہ ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی باتیں کرنا محال ہے کیونکہ آپ اپنی صحت اور مرض دونوں حال میں معصوم ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ (النجم ۳) اور وہ خواہش سے کلام نہیں کرتے ○

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں حالتِ غضب میں اور حالتِ رضا میں حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا اور جب آپ کے متعلق یہ معلوم ہے تو جس صحابی نے یہ کہا اس نے ان پر انکار کرتے ہوئے کہا: جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجالانے میں میں توقف کیا تھا کہ وہ آپ کے پاس قلم اور کاغذ لے کر آئے' تو گویا اس صحابی نے یہ کہا: تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کرنے میں کیوں توقف کر رہے ہو؟ کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ آپ اپنی بیماری میں کوئی بے معنی بات کر رہے ہیں؟ تم آپ کے حکم پر عمل کرو اور جو چیز طلب کی ہے وہ لا کر حاضر کرو کیونکہ آپ حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتے۔ قاضی عیاض نے کہا: یہ سب سے بہترین جواب ہے۔

نیز قاضی عیاض نے کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس نے یہ کہا: کیا آپ بے معنی بات کر رہے ہیں؟ اس نے شدید حیرت اور دہشت سے اس طرح کہا کیونکہ اکثر صحابہ پر آپ کی وفات کے وقت دہشت طاری ہو گئی تھی اور دوسروں نے کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کہنے والے کی مراد یہ ہو کہ آپ کے اوپر درد اور مرض کا غلبہ ہے کیونکہ مریض بے معنی باتیں اسی وقت کرتا ہے' جب اس پر درد کا غلبہ ہوتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کہنے والے نے یہ کلام ان لوگوں کو چپ کرانے کے لیے کہا تھا' جو آپ کے پاس بیٹھ کر بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے' گویا کہ اس نے یہ کہا کہ بلند آواز سے باتیں نہ کرو اس سے آپ کو ایذاء پہنچے گی۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''اھجر'' فعل ماضی ہو اور اس کا معنی ہو: کیا آپ زندگی سے رخصت ہو رہے ہیں؟ اور اس کو مبالغۃً لفظِ ماضی سے ذکر کیا کیونکہ اس نے آپ پر وفات کی علامات دیکھی تھیں۔ علامہ مازری نے کہا ہے کہ جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صراحۃً یہ حکم تھا کہ قلم اور کاغذ لاؤ تو میں کچھ لکھ دوں تو صحابہ نے آپ کا حکم بجالانے میں اس لیے اختلاف کیا کہ کبھی امر اور حکم کے بعد ایسا قرینہ ہوتا ہے جو اسے اس حکم کے عمل کرنے کے وجوب سے خارج کر دیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ان کے علم میں ایسا قرینہ ہو کہ یہ حکم لازماً وجوبِ عمل کے لیے نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنے میں اختیار ہے' اس لیے ان کا اجتہاد مختلف ہو گیا' بعض نے کہا: قلم اور کاغذ لاؤ اور اس حکم پر عمل کرو اور بعض نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اور حضرت عمر کا پختہ ارادہ تھا کہ اس حکم پر عمل کرانا مراد نہیں ہے' کیونکہ ان کے نزدیک ایسے قرائن تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم کسی پختہ ارادہ کے بغیر دیا ہے۔

علامہ نووی نے یہ کہا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عمر نے جو کہا تھا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے' یہ ان کی وقتِ نظر اور قوتِ فقہ کا تقاضا تھا کیونکہ ان کو یہ خدشہ تھا کہ ہو سکتا تھا کہ آپ ایسے اُمور لکھوا دیں جن پر عمل کرنے سے اُمت عاجز ہو اور اگر وہ آپ کے حکم پر عمل نہ کرے تو عذاب کی مستحق ہو گی' نیز انہوں نے ارادہ کیا کہ علماء پر اجتہاد کا دروازہ بند نہ ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے قول پر انکار نہیں کیا' اس میں یہ اشارہ ہے کہ آپ نے حضرت عمر کی رائے کو صائب قرار دیا' نیز حضرت عمر کی رائے کی تائید میں قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ۔ (الانعام: ۳۸) کتاب میں کسی چیز کا شرعی حکم بیان کرنے میں ہم نے کوئی کمی نہیں کی۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ نے جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدید تکلیف ہے اور ان کے نزدیک اس پر قرینہ قائم تھا کہ آپ جو کچھ لکھوانا چاہتے ہیں وہ انہیں معلوم ہے تو انہوں نے کہا: ہمیں کتاب اللہ کافی ہے اور اس کے معارض حضرت ابن عباس کا یہ قول نہیں ہے کہ سب سے بڑی مصیبت وہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لکھوانے کے درمیان حائل ہو گئی اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ قطعی طور پر حضرت ابن عباس سے زیادہ فقیہ تھے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے اس کے متعلق حضرت عمر کا منع کرنا اس پر محمول ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید کرب کی کیفیت ہے اور آپ کی وفات قریب ہے اور وہ اس سے ڈرے کہ آپ جو کچھ لکھوائیں اس میں منافقین کو کسی قسم کے طعن کا راستہ مل جائے یہ بات نہیں تھی کہ حضرت عمر نے عمداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی اور نہ یہ بات تھی کہ حضرت عمر کے نزدیک آپ کے لکھوانے میں کوئی غلطی ہو سکتی تھی۔ حاشا و کلا۔

آپ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو میں جس کیفیت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو: علامہ ابن الجوزی وغیرہ نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور وہ اس زندگی سے بہتر ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ میں جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے انتظار میں ہوں اور اس میں غور و فکر کر رہا ہوں وہ اس سے افضل ہے جس کا تم مجھ سے سوال کر رہے ہو کہ لکھوانے میں کوئی مصلحت ہے یا نہیں یا اس کا معنی یہ ہے کہ میں جو تمہیں کچھ لکھ کر نہیں دے رہا وہ اس سے بہتر ہے جس کو تم مجھے لکھنے کی دعوت دے رہے ہو۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی میں تمہیں جو کچھ لکھوانا چاہتا ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے نہ لکھنے کی دعوت دے رہے ہو بلکہ یہی زیادہ ظاہر ہے اور اس سے پہلے ہم نے کہا تھا کہ آپ کا یہ حکم اختیاری ہے یا بطور امتحان ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کو آپ کی مراد کی طرف ہدایت دی تھی اور دوسروں سے یہ چیز پوشیدہ رکھی تھی۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تین وصیتیں کیں: یہ اس کی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ لکھوانے کا ارادہ کیا تھا وہ کوئی واجب حکم نہیں تھا کیونکہ اگر وہ ایسا ہوتا تو جس کی تبلیغ کا آپ کو حکم دیا گیا تھا تو آپ صحابہ کے اختلاف کی وجہ سے اس کو ترک نہ فرماتے اور اللہ تعالیٰ اس کو سزا دیتا' جو آپ کے اور آپ کی تبلیغ کے درمیان حائل ہوتا اور آپ ضرور اپنے قول سے اس حکم کی تکمیل فرماتے جس طرح آپ نے ان کو یہ وصیت کی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور اس گفتگو کے بعد آپ کئی دن تک زندہ رہے اور صحابہ نے آپ سے بہت سی چیزیں سن کر یاد رکھیں' اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے لازماً کچھ لکھنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا۔

اور وفد کو انعام و اکرام دینا: یعنی ان کو عطاء کرنا اور "جائزہ" کا معنی "عطیۃ" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں وفد کو چالیس درہم عطاء فرماتے تھے۔

آپ نے تیسری وصیت سے سکوت کیا' یا راوی نے کہا: میں بھول گیا: علامہ داؤدی نے کہا کہ تیسری وصیت قرآن پر عمل کرنے کی تھی اور علامہ ابن التین نے بھی اسی کو وثوق سے کہا ہے اور علامہ المہلب نے کہا ہے: بلکہ تیسری وصیت حضرت اسامہ کے لشکر کو بھیجنے کے متعلق تھی' علامہ ابن بطال نے بھی اسی کی تائید کی ہے کہ جب حضرت ابوبکر کے سامنے حضرت اسامہ کے لشکر کو بھیجنے میں صحابہ کا اختلاف ہوا تو ان سے حضرت ابوبکر نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت اس کی وصیت کی تھی۔ قاضی عیاض نے کہا: بلکہ یہ وصیت آپ کا یہ ارشاد تھی کہ میری قبر کو بت نہ بنانا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیسری وصیت وہ ہو جو حضرت انس رضی اللہ سے آپ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ نماز کو لازم رکھنا اور باندیوں سے حسن سلوک کرنا۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۵۱-۱۵۰' دار المعرفہ بیروت' ۱۴۲۶ھ)

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

اور رسول تم کو جو احکام دیں ان کو قبول کرو اور جن کاموں سے تم کو منع کریں ان سے باز رہو

شرح صحیح مسلم

جلد رابع

عتاق، بیوع، مساقات، مزارعت، وصیت، نذر، ایمان

قسامت، قصاص، دیات، حدود

تصنیف

علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ کراچی ۳۸

ناشر

فرید بک سٹال ۳۸ اردو بازار لاہور ۲

الی الجنۃ وان الملائکۃ لتضع اجنحتہا لطالب العلم رضا بہ وانہ یستغفر لطالب العلم من فی السماء ومن فی الارض حتی الحوت فی البحر وفضل العالم علی العابد کفضل القمر علی سائر النجوم لیلۃ البدر وان العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن ورثوا العلم فمن اخذ منہ اخذ بحظ وافر۔ ۱؎

پر چلائے گا اور بے شک طالب علم کو راضی کرنے کے لیے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں اور طالب علم کی مغفرت کے لیے تمام آسمان اور زمین والے دعا کرتے ہیں حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں دعا کرتی ہیں اور عالم کی عابد پر فضیلت ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی ستاروں پر فضیلت ہے اور علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء دینار اور درہم کا وارث نہیں بناتے البتہ علم کا وارث بناتے ہیں سو جس نے علم کو حاصل کیا اس نے ایک عظیم حصہ کو حاصل کیا۔

ان دونوں حدیثوں میں اس کی تصریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام مال کو وراثت میں نہیں چھوڑتے سو یہ کہنا غلط ہے کہ نبی علیہ السلام نے فدک کو وراثت میں چھوڑا تھا۔

اَھَجَرَ کی تحقیق حدیث نمبر ۴۱۱۹ میں ہے "اَھَجَرَ" اس لفظ میں دو احتمال ہیں یا تو یہ ھُجُر (بضم الھاء) سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہذیان یعنی شدت مرض کی بناء پر مریض کا اول فول اور بے ربط باتیں کرنا یعنی کیا آپ ہذیان کہہ رہے ہیں؟ یہ استفہام انکاری ہے یعنی آپ العیاذ باللہ کوئی ہذیان تو نہیں کہہ رہے سنجیدگی سے کاغذ اور دوات منگوا رہے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ ھَجَرَ (بفتح الھاء) سے ماخوذ ہو اس کا معنی فراق اور وداع ہے اور یہی معنی صحابہ کرام کے مقام کے لائق ہے یعنی آپ جو وصیت لکھوانے کے لیے کاغذ اور دوات منگوا رہے ہیں تو کیا آپ ہم سے الوداع ہو رہے ہیں!

حدیث قرطاس میں حضرت عمر پر حضور کا کہنا نہ ماننے کا اعتراض اور اس کے جوابات۔!

حدیث قرطاس کی بناء پر اہل تشیع کا مشہور اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ اور دوات لانے کا حکم دیا تھا اور حضرت عمر اور ان کے متبعین نے کاغذ اور دوات نہ لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی۔ اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ اگر یہ بالفرض معصیت ہے تو اس میں حضرت عمر اور ان کے متبعین منفرد نہیں ہیں بلکہ اس معصیت میں تمام اہل بیت شریک ہیں، کیونکہ کاغذ اور دوات کسی نے لا کر نہیں دی، خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول موجود ہے، امام احمد روایت کرتے ہیں:

عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال امرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اتیہ بطبق یکتب فیہ مالا تضل امتہ من

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں ایک طبق لے کر آؤں جس پر آپ ایسی چیز لکھ دیں گے جس

۱؎ شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ، الاصول من الکافی ج ۱ ص ۳۴، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ تہران۔

الی الجنة وان الملائكة لتضع اجنحتها لطالب العلم رضا به وانه يستغفر لطالب العلم من في السماء ومن في الارض حتى الحوت في البحر وفضل العالم على العابد كفضل القمر على سائر النجوم ليلة البدر وان العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما ولكن ورثوا العلم فمن اخذ منه اخذ بحظ وافر۔ [1]

پر چلائے گا اور بے شک طالب علم کو راضی کرنے کے لیے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں اور طالب علم کی مغفرت کے لیے تمام آسمان اور زمین والے دعا کرتے ہیں حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں دعا کرتی ہیں اور عالم کی عابد پر فضیلت ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی ستاروں پر فضیلت ہے اور علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء دینار اور درہم کا وارث نہیں بناتے البتہ علم کا وارث بناتے ہیں سو جس نے علم کو حاصل کیا اس نے ایک عظیم حصہ کو حاصل کیا۔

ان دونوں حدیثوں میں اس کی تصریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام مال کو وراثت میں نہیں چھوڑتے سو یہ کہنا غلط ہے کہ نبی علیہ السلام نے فدک کو وراثت میں چھوڑا تھا۔

اَھَجَرَ کی تحقیق

حدیث نمبر ۴۱۱۹ میں ہے اَھَجَرَ اس لفظ میں دو احتمال ہیں یا تو یہ ھُجر (بضم الہاء) سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہذیان یعنی شدت مرض کی بناء پر مریض کا اول فول اور بے ربط باتیں کرنا یعنی کیا آپ ہذیان کہہ رہے ہیں؟ یہ استفہام انکاری ہے یعنی آپ ایسا فی الواقع کوئی ہذیان تو نہیں کہہ رہے سنجیدگی سے کاغذ اور دوات منگوا رہے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ ھَجر (بفتح الہاء) سے ماخوذ ہو اس کا معنی فراق اور وداع ہے اور یہی معنی صحابہ کرام کے مقام کے لائق ہے یعنی آپ جو وصیت لکھوانے کے لیے کاغذ اور دوات منگوا رہے ہیں تو کیا آپ ہم سے الوداع ہو رہے ہیں!

حدیث قرطاس میں حضرت عمر پر حضور کا کہنا نہ ماننے کا اعتراض اور اس کے جوابات!

حدیث قرطاس کی بناء پر اہل تشیع کا مشہور اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ اور دوات لانے کا حکم دیا تھا اور حضرت عمر اور ان کے متبعین نے کاغذ اور دوات نہ لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی، اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ اگر یہ بالفرض معصیت ہے تو اس میں حضرت عمر اور ان کے متبعین منفرد نہیں ہیں بلکہ اس معصیت میں تمام اہل بیت شریک ہیں، کیونکہ کاغذ اور دوات کسی نے لا کر نہیں دی، خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول موجود ہے، امام احمد روایت کرتے ہیں:

عن علی بن ابی طالب رضی الله عنه قال امرنی النبی صلی الله علیه وسلم ان اتیه بطبق یکتب فیه ما لا تضل امته من

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں ایک طبق لے کر آؤں جس پر آپ ایسی چیز لکھ دیں گے جس

۱؎ شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ، الفروع من الکافی ج ۱ ص ۳۴، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ تہران۔

بعدہ، قال فخشیت ان تفوتنی نفسہ، قال: قلت انی احفظ واعی قال اوصی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ [1]

کی وجہ سے آپ کی امت آپ کے بعد گمراہ نہیں ہوگی حضرت علی نے کہا مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں آپ فوت نہ ہو جائیں میں نے کہا میں اس کو حفظ کر لوں گا اور یاد کر لوں گا! آپ نے فرمایا میں نماز، زکوٰۃ اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔

اس اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر اور ان کے موافقین کا دوات اور کاغذ نہ لا کر دینا کسی عناد اور معصیت کی بناء پر نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درد سے شدید تکلیف ہو رہی ہے اور اس حالت میں لکھوانے سے کہیں آپ کو زیادہ تکلیف نہ ہو جائے اس لیے ان کا یہ کہنا حسبنا کتاب اللہ "ہمیں کتاب اللہ کافی ہے" آپ سے شدید محبت اور آپ کو تکلیف کی شدت سے بچانے کے لیے تھا، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار قریش نے صلح نامہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا محمد رسول اللہ کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو تو حضرت علی نے فرمایا لا واللہ لا امحوک ابداً۔ "نہیں خدا کی قسم میں آپ کا نام نہیں مٹاؤں گا!" [2] تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی نے عناد اور معصیت کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نہیں مانا بلکہ ہر خوش فہم اور صاحب عقل شخص یہی کہے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس حکم کو نہ ماننا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور محبت کی بناء پر تھا۔

اس اعتراض کا تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر کا گمان یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک فوت نہیں ہوں گے جب تک تمام منافقین کو تہ تیغ نہ کر لیں اور فارس اور روم پر اسلام کے جھنڈے نہ گاڑ دیں اور ان کا خیال یہ تھا کہ اگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھا تو کوئی بات نہیں تندرست ہونے کے بعد لکھ دیں گے اس توجیہ کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے، امام ابن سعد واقدی روایت کرتے ہیں:

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فی مرضہ الذی مات فیہ ائتونی بدواۃ وصحیفۃ اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا فقال عمر بن الخطاب من لفلانۃ وفلانۃ من مدائن الروم؟ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس بمیت حتی نفتتحہا۔ [3]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں فرمایا مجھے دوات اور کاغذ لا کر دو میں تم کو ایسی چیز لکھ کر دوں گا جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے، حضرت عمر بن الخطاب نے کہا فلاں فلاں اور روم کے شہروں کا کیا ہو گا، جب تک ہم ان شہروں کو فتح نہ کر لیں رسول اللہ فوت نہیں ہوں گے۔

---

[1] امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، مسند احمد ج ۱ ص ۹۰، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ

[2] امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۷۳، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۸۱ھ

[3] امام محمد بن سعد واقدی متوفی ۲۳۰ھ، الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۲۴۴ مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۳۸۸ھ

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی فوت نہیں ہوں گے، اس لیے جلدی کی کیا ضرورت ہے، بلکہ اس شدید علالت میں آپ کو لکھوانے کی زحمت دی جائے جیسا کہ اس باب کی حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد غالب ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے ہمیں کتاب اللہ کافی ہے!

اس اعتراض کا چوتھا جواب یہ ہے کہ کئی مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر حضرت عمر اپنی رائے پیش کرتے، اگر وہ رائے صحیح ہوتی تو حضور حضرت عمر کے مشورے کو قبول فرما لیتے اور اگر غلط ہوتی تو رد فرما دیتے مثلاً صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ کو اپنی نعلین دے کر یہ اعلان کرنے کے لیے کہا جو شخص صمیم قلب سے لا الہ الا اللہ کی گواہی دے اس کو جنت کی بشارت دے دو، حضرت عمر نے مشورہ دیا فخلهم يعملون۔ لوگوں کو عمل کرنے دیں یعنی اس بشارت سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر لوگ عمل کرنا نہ چھوڑ دیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو قبول فرما لیا، عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی نماز جنازہ پڑھنے سے حضرت عمر نے بہت اختلاف کیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے قبول نہیں فرمائی اور عبد اللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ صلح حدیبیہ کی شرائط سے حضرت عمر نے بہت شدید اختلاف کیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے اختلاف کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں شرائط پر صلح کی۔ اگر اس موقع پر بھی حضرت عمر کی رائے غلط اور خطا تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تردید کرتے اور اتنے اہم امر کا لکھوانا نہ چھوڑتے جس پر مسلمانوں کے گمراہی سے بچنے کا مدار تھا، نبی کی بعثت ہی اس لیے ہوتی ہے کہ وہ ان باتوں کو بیان کرے جن پر گمراہی سے بچنا موقوف ہے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسے امر کو حضرت عمر کے کہنے کی وجہ سے چھوڑ دیا تو یہ العیاذ باللہ منصب نبوت اور رسالت کے خلاف ہے۔

اس اعتراض کا پانچواں جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے دوات اور کاغذ لا کر نہیں دیا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عتاب کیا نہ انہیں کوئی سزا دی نہ ان کی تہدید اور تغلیظ کی البتہ اس میں بحث کرنے والوں سے یہ فرمایا "کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ نبی کے پاس بیٹھ کر بحث کرنا مناسب نہیں ہے"۔ جتنی بات غلط تھی وہ یہی نبی کے سامنے آپس میں بحث کرنا اس غلطی پر ٹوک دیا اگر دوات اور کاغذ لا کر نہ دینا بھی غلط ہوتا تو اس پر بھی ٹوک دیتے۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کو لکھوانا چاہتے تھے اگر وہ مسلمانوں کے دین اور شریعت کی کوئی ضروری اور ناگزیر چیز تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لکھوانے کو کبھی ترک نہ کرتے، حضرت عمر تو الگ رہے اگر ساری کائنات بھی مخالفت کرتی تب بھی آپ اس کو ترک نہ کرتے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته (مائدہ: ۶۷) "جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا اس کو پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے (ایسا) نہ کیا تو آپ نے کار رسالت انجام نہ دیا" جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کی سخت مخالفت، دھمکیوں اور ضرر رسانیوں کے باوجود تبلیغ ترک نہیں کی تھی۔

ساتواں جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے بعد چار دن زندہ رہے (کیونکہ یہ جمعرات کا واقعہ ہے اور پیر کو آپ کا وصال ہوا ہے) پس جس چیز کو آپ لکھوانے کے لیے کہہ رہے تھے اگر اس کا لکھوانا ضروری ہوتا تو ان دنوں میں آپ لکھوا دیتے، جبکہ ان ایام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور متعدد احکام ثابت ہیں اور بعض ہی روایات میں ہے کہ ان ایام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں تخفیف ہو گئی تھی اگر یہ کوئی ناگزیر چیز تھی تو آپ ان

ایام میں لکھوا دیتے۔

آٹھواں جواب یہ ہے کہ اگر یہ کوئی اہم چیز نہیں تھی اور واقعۃً ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم با دلائل بیان کر چکے ہیں تو حضرت عمر پر اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ حضرت عمر نے ایک غیر اہم چیز کے لیے شدت مرض میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا۔

نواں جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے امت پر شفقت کی خاطر یا کسی اور سبب سے کچھ لکھوانا چاہا بعد میں وحی کے ذریعہ یا اجتہاد سے آپ پر یہ منکشف ہوا کہ اس چیز کا نہ لکھوانا ہی بہتر ہے۔

دسواں جواب یہ ہے کہ شریعت میں جو احکام آ چکے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی کی تاکید کے طور پر کچھ لکھوانا چاہتے تھے اور جب حضرت عمر نے کہا حسبنا کتاب اللہ "ہمیں کتاب اللہ کافی ہے" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاکید کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کی خلافت کے بارے میں کچھ لکھوانا چاہتے تھے؟

اہل تشیع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کی خلافت کے بارے میں کچھ لکھوانا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر نے اس کی مخالفت کی۔ یہ صرف بے بنیاد مفروضہ ہے اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اول تو یہ کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے کہ آپ امر خلافت کے بارے میں لکھوانا چاہتے تھے۔ اور اگر آپ بالفرض امر خلافت کے بارے میں لکھوانا چاہتے تھے تو یہ کیسے لازم آیا کہ آپ حضرت علی کی خلافت کے بارے میں لکھوانا چاہتے تھے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں لکھوانا چاہتے ہوں۔ اور قرآن سے یہی ثابت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو حج میں اپنا خلیفہ بنایا اور حضور کی زندگی میں حضرت ابوبکر کی قیادت اور امامت میں مسلمانوں نے فریضہ حج ادا کیا، دو بار آپ نے حضرت ابوبکر کی اقتداء میں نماز کا کچھ حصہ پڑھا ایک بار جب بنو عمرو بن عوف کی صلح کے لیے تشریف لے گئے تھے تو عصر کی نماز کا کچھ حصہ حضرت ابوبکر کی اقتداء میں پڑھا اور جب حضرت ابوبکر کو علم ہوا تو وہ پیچھے آ گئے اور باقی نماز آپ نے پڑھائی[1] اور دوسری بار پیر کا دن تھا جب آپ کا وصال ہوا اس دن صبح کی نماز آپ نے حضرت ابوبکر کی اقتداء میں پڑھی، یہ آپ کی دنیا میں آخری نماز تھی[2] آپ نے اپنی آخری علالت میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے باہم منع کرنے کے باوجود باصرار فرمایا: مروا ابابکر ان یصلی بالناس[3] "ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں" اور ایام علالت میں حضرت ابوبکر نے سترہ نمازیں پڑھائیں[4]

۱۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۸۱ھ

۲۔ امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ، سنن کبریٰ ج ۳ ص نمبر ۸۳ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان

۳۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۸۱ھ

۴۔ ملا علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ، مرقات ج ۳ ص ۹۶ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ

جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا، گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر یعنی ثبوت حدیث کے تینوں طریقوں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو حضرت ابوبکر ہی مسلمانوں کے امام تھے اور آپ رفیق اعلیٰ سے اس حال میں واصل ہوئے کہ مسلمانوں کو حضرت ابوبکر کی امامت کے سپرد کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر کے انتخاب کے وقت فرمایا: ہم اپنی دنیا کی امامت کے لیے اس شخص پر راضی ہو گئے جس کی ہمارے دین میں امامت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو چکے تھے۔ [۱]

حضرت ابوبکر کے استخلاف پر سب سے واضح اور روشن قرینہ یہ حدیث ہے:

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

عن عائشة قالت قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضه ادعی لی ابا بکر اباک و اخاک حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول انا اولی و یابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر [۲]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی علالت میں فرمایا: اپنے باپ ابوبکر کو اور اپنے بھائی کو میرے پاس بلاؤ تاکہ میں انہیں (امر خلافت) لکھ کر دے دوں، کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا (خلافت کی) تمنا کرے گا اور کہے گا کہ میں زیادہ مستحق ہوں اور اللہ اور مسلمان ابوبکر کے سوا کسی کو نہیں مانیں گے۔

اس حدیث کو امام بخاری نے دو جگہ روایت کیا ہے، کتاب المرضیٰ میں [۳] اور کتاب الاحکام میں [۴]۔

جو لوگ صحیحین کی اس روایت (حدیث قرطاس) کی وجہ سے حضرت عمر پر اعتراض کرتے ہیں انہیں صحیحین کی اس روایت پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔

عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنه ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طرقه وفاطمة بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیلة فقال الا تصلیان فقلت یا رسول اللہ انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا فانصرف حین قلت ذلک ولم یرجع

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے اور حضرت فاطمہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کیا تم نماز نہیں پڑھتے! میں نے کہا یا رسول اللہ! ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں جب وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو اٹھا دیتا ہے! جب میں نے یہ کہا تو نبی صلی اللہ علیہ

۱۔ حافظ ابوعمرو یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر مالکی متوفی ۴۶۳ھ، الاستیعاب علی ہامش الاصابہ ج ۲ ص ۲۴۸، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۳۹۸ھ

۲۔ امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۳، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۷۵ھ

۳۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۴۶، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۸۱ھ

۴۔ 〃 صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۳، ۱۰۷۱ 〃 〃 〃

الی شیئا ثم سمعته وهو مول یضرب فخذه وهو یقول وكان الانسان اكثر شیء جدلا۔ ۱؎

وسلم واپس لوٹ گئے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا پھر میں نے سنا جب آپ پیٹھ پھیر کر جا رہے تھے تو اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے فرما رہے تھے: "انسان سب سے زیادہ بحث کرنے والا ہے"۔



۱؎ امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۲، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۸۱ھ

فاروق اعظم نمبر

مرتبین

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

ڈاکٹر محمد [illegible] نظامی

حدیثِ قرطاس

تحریر

مولانا محمود احمد رضوی

مسئلہ قرطاس پر غور و فکر کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اصل واقعہ کو سمجھ لیا جائے یہاں ہم اس واقعہ سے متعلق دو روایتیں پیش کرتے ہیں جس سے اصل صورت حال واضح ہوتی ہے۔

عن عبد اللہ بن عباس قال لما حضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی البیت رجال فیہم عمر ابن الخطاب قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ، قال عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب اللہ فاختلف اہل البیت فاختصموا منہم من یقول قربوا یکتب لکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتابا لن تضلوا بعدہ ومنہم من یقول ما قال عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوموا عنی۔

ترجمہ

جب حضور کی وفات کا وقت قریب آیا تو دولت خانہ نبوی میں لوگ جمع تھے جن میں حضرت عمر بن الخطاب بھی تھے حضور نے فرمایا کہ آؤ تم کو ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا حضور کو اس وقت

بیماری کی تکلیف زیادہ ہے تمہارے پاس قرآن ہے اور قرآن ہمارے واسطے کافی ہے پس گھر والوں نے اختلاف کیا بعض کہتے تھے کہ سامان کتابت حضور کے پاس رکھ دو تاکہ وہ تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دیں کہ جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے اور بعض وہی بات کہتے تھے جو حضرت عمر نے کہی تھی پس جب ان کا اختلاف زیادہ ہوا اور باتیں بڑھیں تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس سے اُٹھ جاؤ۔ (بخاری)

دُوسری روایت یہ ہے۔

عن سعید ابن جبیر قال قال ابن عباس یوم الخمیس وما یوم الخمیس اشتد برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجعه فقال ایتونی بکتاب اکتب لکم کتاباً لن تضلوا بعدہ ابداً فتنازعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا ما شانه اھجر استفھموہ فذھبوا یردون عنه فقال دعونی انا فیه خیر مما تدعونی الیه واوصاھم بثلاث قال اخرجوا الیھود من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم وسکت عن الثالثة او قال فنسیتھا۔

(بخاری جلد دوم)

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے کہا جمعرات کا دن اور کیسا جمعرات کا دن کہ اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد زیادہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا (سامان کتابت) میرے پاس لاؤ تاکہ تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دوں کہ جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے پس حاضرین نے اختلاف کیا اور کسی پیغمبر کے پاس تنازع مناسب نہیں پس بعض نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کیا ہے کیا جدائی کا وقت قریب آگیا ہے آپ سے دریافت تو کر لو پس وہ معاملہ کتابت کو آپ پر دوبارہ پیش کرنے لگے اس پر آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو کیونکہ میں جس حالت میں ہوں (مراقبہ حق میں) وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ آپ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی۔

(۱) مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو (۲) وفود کو اسی طرح انعام دیا کرو جیسے میں دیا کرتا ہوں تیسری بات سے سعید ابن جبیر چپ رہے یا ابن جبیر تو بیان کر دی اور میں اس کو بھول گیا۔ (بخاری و مسلم)

جو بات لکھوانا چاہتے تھے اس کی کیا حیثیت تھی؟

واقعہ قرطاس کی یہ دو روایتیں اصل واقعہ کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم نے نقل کی ہیں اب جو امور اس سلسلہ میں قابل غور و فکر ہیں۔ وہ بیان کیے جاتے ہیں۔ قارئین کرام تعصب سے بالاتر ہو کر بغور مطالعہ فرمائیں۔

واقعہ قرطاس کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو بات لکھوانا چاہتے تھے اس کی کیا حیثیت تھی؟ کیا وہ کوئی ایسی بات تھی جو آپ کے فرائض نبوت میں سے تھی۔ اور جس کے اظہار کے بغیر دین نامکمل رہ جاتا تھا؟ واقعہ قرطاس کی روایات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے جو بات حضور لکھوانا چاہتے تھے اس کی یہ حیثیت نہ تھی جس کے دلائل یہ ہیں۔

اوّل: یہ ایک اصولی بات ہے کہ انبیاء کرام خدا کی طرف سے جن امور کی تبلیغ کے لیے مبعوث ہوں اور جس بات کی تبلیغ ان کا فرض نبوت ہو وہ اس میں قطعاً حتماً کسی حال میں کوتاہی نہیں کر سکتے حضورؐ کو حکم تھا:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ (القرآن)

اے نبی خدا کی طرف سے جو احکامات آئیں ان کی تبلیغ فرماؤ۔ اگر ایسا نہ کیا تو تم نے اپنا فرض نبوت ادا نہ فرمایا اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرماتا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احکام الٰہیہ کی تبلیغ میں کوتاہی نہیں فرما سکتے تو اگر یہ تحریر دین کی نہایت ہی اہم ضروری بات پر مشتمل ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس کو لکھوا دیتے خواہ کوئی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرتا۔

دُوم: اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمرؓ نے سامان کتابت پیش نہیں ہونے دیا تو یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضور اکرم نے سامان کتابت لانے کا حکم صرف حضرت عمر کو نہیں دیا تھا بلکہ تمام حاضرین کو دیا تھا کیونکہ اِئْتُونی جمع کا صیغہ ہے جو یہ بتا رہا ہے کہ جیسی اس حکم کی تعمیل کی ذمہ داری حضرت عمر پر آتی تھی۔ اسی قدر ان تمام حاضرین مجلس پر آتی تھی جس میں حضرت علی بھی شامل تھے بلکہ حضرت علی پر اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ آتی تھی کیونکہ بزعم شیعہ یہ تحریر انہیں کی خلافت سے متعلق تھی۔ اور دولت خانہ نبوی میں کتابت وحی کا کام بھی انہیں کے سپرد تھا لہٰذا ان کا فرض تھا کہ وہ سامان کتابت بحضور نبوی پیش کر دیتے مگر انہوں نے بھی نہ کیا بلکہ حاضرین میں سے کسی نے بھی سامان کتابت پیش نہ کیا۔ البتہ بعض نے حضور سے کئی بار یہ پوچھا کہ ہم سامان کتابت پیش کر دیں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر عدم تعمیل حکم کا الزام حضرت عمر پر آتا ہے تو حضرت علیؓ پر بھی آئے گا بلکہ تمام وہ طعن اور الزامات جو شیعہ حضرات عمر پر قائم کرتے ہیں وہ سب کے سب تمام حاضرین مجلس پر قائم ہوں گے اور حضرت علی نہیں بچیں گے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علیؓ (معاذ اللہ)

سُوم ایسے بزدل تھے کہ حضرت عمرؓ کی موجودگی میں ایسا نہ کر سکتے تھے تو یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ جمعرات کے دن کا ہے حضورؐ کا وصال پیر کے دن ہوا حضرت علیؓ اس مدت میں جب کہ حضرت عمرؓ نہ ہوتے تحریر لکھواتے یا حضور ہی لکھوا دیتے۔

چہارم اور اگر یہ کہا جائے کہ معاذ اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت عمرؓ سے ڈر گئے تھے اور تحریر نہ لکھوا سکے تو اوّل تو یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو اعلیٰ درجہ کا منافق ہو ایک مسلمان تو ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم دین کی نہایت ضروری بات کسی سے ڈر کر نہ بیان کریں اور اگر نبی کے متعلق ایسا مان لیا جائے تو پھر تو نبوت ایک کھیل ہو جائے گی اور سارا دین ہی نا قابل اعتبار قرار پائے گا کہ نامعلوم نبی اکرم نے (معاذ اللہ) کتنے احکام ربانی خوف کی وجہ سے امت تک نہیں پہنچائے کیا یہ بات کسی کی عقل میں آسکتی ہے کہ وہ رسول جس نے مخالفوں کی

خیبر میں توحید کا اعلان کیا اور تلواروں کی جھنکاروں میں حق کا اظہار فرمایا اور باطل کا ابطال کیا وہ حضرت عمرؓ سے ڈر جائے کہ اپنی امّت کے لیے ایسی ضروری تحریر نہ لکھوائیے۔

پنجم

یہ بھی ظاہر ہے کہ حاضرین کا اختلاف کرنا بھی حضور کو دین کی کسی اہم بات کی تبلیغ سے نہیں روک سکتا کیونکہ جب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان کتابت لانے کا حکم فرمایا تو حاضرین میں سے کسی نے بھی حضور سے بحث و تکرار نہیں کی۔ کسی ایک نے بھی حضور سے یہ نہیں کہا کہ آپ تحریر کا ارادہ ملتوی فرمادیں جو بحث و تکرار ہوئی وہ آپس میں ہوئی ایک فریق تحریر لکھوانے کے حق میں تھا اور دوسرے کی رائے یہ تھی کہ حضور اس وقت تکلیف میں ہیں

اس لیے تحریر کی تکلیف نہ دی جائے ظاہر ہے کہ اگر حضور چاہتے تو حاضرین کے آپس میں اختلاف کرنے کے باوجود سامان کتابت لانے کا حکم دوبارہ فرما دیتے اور اگر حضور تحریر کا دوبارہ ارادہ فرمالیتے ہیں تو کس میں طاقت تھی کہ وہ آپ کو روک سکتا مگر حضور نے دوبارہ تحریر کا ارادہ ہی نہیں فرمایا کیا نبی جس بات کی تبلیغ کے لیے مبعوث ہوا۔ اس کو محض حاضرین میں سے چند افراد کے اختلاف کرنے کی وجہ سے ترک کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ششم

جب حاضرین میں سامان کتابت پیش کرنے میں جھگڑا ہوا تو حضرت عمر کے حسبنا کتاب اللہ کہنے کے بعد حاضرین مجلس میں سے بعض نے معاملہ کتابت کو دوبارہ حضور پر پیش کیا حضور چاہتے تو اس وقت بڑی آسانی سے تحریر لکھوا سکتے تھے۔ مگر آپ نے نہ لکھوائی۔

ہفتم

واقعہ قرطاس سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہو چکی تھی یعنی دین کی تکمیل تو تین ماہ قبل ہو چکی تھی اور اُمت کو گمراہی سے بچانے والے جس قدر امور تھے۔ وہ سب بیان ہو چکے تھے اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم

نے یہ بتا دیا تھا کہ اب دین کامل و مکمل ہو گیا اب کسی حکم کی تبدیلی، منسوخ کمی و بیشی نہیں ہو سکتی یعنی اس کے نزول کے بعد دین کی کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی تھی جو کتاب و سنت میں نہ آ گئی ہو۔

اور حضور نے اس کی تبلیغ نہ فرما دی ہو تو اب اگر یہ مانا جائے کہ جو بات حضور لکھوانا چاہتے تھے وہ دین کی ایسی ضروری بات تھی کہ جس کے بغیر دین مکمل نہیں ہو سکتا تھا تو پھر تو تکمیل دین کا اعلان صحیح قرار نہیں پائے گا اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم کی تکذیب ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے نزول اور دین کی تکمیل و تبلیغ کے بعد جو بات حضور لکھوانا چاہتے تھے وہ امور بطور تاکید ہی لکھوانا چاہتے تھے۔

اور ان کی حیثیت صرف یہ تھی جیسے کوئی بزرگ کسی جگہ سے یا دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے متعلقین کو چند اہم امور کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ سو ایسا ہو بھی گیا حضور نے اپنی حیات کے آخری ایام میں بیان فرمائے وہ وہی ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی طرح پہلے ہی سے کتاب و سنت میں آ چکا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا تحریر کرانا چاہتے تھے؟

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ :-

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن امور کے لکھوانے کے لیے سامان کتابت طلب فرمایا تھا وہ کیا تھے؟

(۲) اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسبنا کتاب اللہ کہا تو اس کے بعد بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کو لکھوایا یا زبانی ارشاد فرمایا۔

تو صحیح روایتوں سے بلکہ خود اسی روایت سے جس سے واقعہ قرطاس مذکور ہے اسی میں یہ بھی ہے کہ پھر آپ نے اوصاھم بثلاث قال اخرجوا المشرکین من

جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد بنحو

ماکنت اجیزھم وسکت عن الثالثۃ اوقال نسیتھا

(مصری) بخاری جلد ۳ صفحہ ۶۵

تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ اول مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ وفود کو اسی طرح انعام دو جس طرح میں دیا کرتا تھا تیسری وصیت سے سعید ابن جبیر چپ رہے یا انہوں نے تو بیان کردی مگر میں بھول گیا۔

لیکن یہ تیسری وصیت جس کو راوی حدیث بھول گئے ہیں وہ موطا امام مالک بلکہ بخاری مصری جلد ۳ صفحہ نمبر ۹۶ سے معلوم ہو جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

کان اخر ماتکلم بہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان قال قاتل اللہ الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد۔

حضور نے اپنی زندگی پاک میں سب سے آخری کلام یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کو قتل کرے انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا ہے۔

تو جب وہ امور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانی ارشاد فرما دیئے تو اب حضرت عمر پر یہ الزام کیسے قائم ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ضروری بات نہیں لکھی جو امت کو گمراہی سے بچاتی

پس جب واقعہ قرطاس کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ جن امور کے لکھوانے کے لیے حضور اکرم نے دوات قلم طلب فرمایا تھا وہی امور آپ نے زبانی بیان فرما دیئے تو ایسی صورت میں جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کسی طعن کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور حضرت علی کی خلافت کے متعلق تحریر لکھوانا چاہتے تھے حالانکہ اس کی تصریح کسی صحیح و معتبر روایت میں نہیں ملتی۔ لہذا یہ محض ان کا ایک دعویٰ ہے جو بلا دلیل ہے۔ البتہ بخاری و مسلم کی حدیثوں سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ حضور حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے متعلق تحریر لکھوانے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور نے اپنے مرض وفات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے

فرمایا۔

اُدعی لی ابا بکرٍ واخاکِ حتی اکتب کتاباً فانی اخاف ان یتمنی متمنٍ ویقول قائل انا ولا ویابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر۔ بخاری ومسلم

(مشکوٰۃ باب المناقب ابوبکر)

اپنے باپ اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ تاکہ میں ایک تحریر لکھ دوں کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے اور کہنے والا کہے کہ میں خلافت کا مستحق ہوں اور اللہ تعالیٰ اور مومنین دونوں انکار کرتے ہیں۔ ابوبکر کے سوا کسی دوسرے شخص کی خلافت سے۔

وحیٔ خداوندی یا اجتہادِ نبوی

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر لکھوانے کا ارادہ وحی خداوندی کے ماتحت فرمایا تھا یا اپنے اجتہاد کے ماتحت میرے نزدیک صحیح یہ ہی ہے کہ حضور نے تحریر لکھوانے کا ارادہ اپنے اجتہاد کے ماتحت فرمایا تھا کیونکہ اگر آپ کا یہ ارادہ وحیٔ الٰہی کے مطابق ہوتا تو تحریر لکھوانا آپ کا فرض نبوت قرار پاتا اور نبی اپنے فرض نبوت میں کوتاہی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آپ حکم الٰہی کے ماتحت بہرصورت تحریر لکھواتے رہتے حاضرین یا حضرت عمرؓ تو حضور ان کو صاف صاف فرما سکتے تھے کہ میری علالت اس تحریر کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تم میری ناسازگی طبع کا خیال کرکے تحریر نہ لکھوانے کا مشورہ دے رہے ہو مگر یہ تحریر تو حکم خداوندی ہے۔

یہ بہرصورت لکھوائی جائے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضور نے تحریر نہ لکھوائی لہٰذا یہ ماننا پڑے گا۔

کہ حضور کا تحریر لکھوانے کا ارادہ فرمانا اجتہاد پر مبنی تھا۔ اور پھر اس کو ملتوی فرما دینا بھی اجتہاد ہی پر مبنی تھا۔

لفظ ہُجر کی تحقیق اور یہ لفظ کس نے کہا؟

واقعہ قرطاس سے حضرات شیعہ حضرت عمرؓ پہ جو الزامات قائم کرتے ہیں ان میں سب سے اہم اور سب سے شدید الزام ان کا یہ ہے کہ جب حضورؐ نے سامان کتابت لانے کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ نے کہا۔

"أھُجر" شیعہ کہتے ہیں کہ ہجر کے معنی یہاں صرف ہذیان کے ہیں اور یہ لفظ حضرت عمرؓ نے رسول کریمؐ کی شان میں کہہ کر آپ کی سخت وشدید توہین کی ہے جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ہی غلط اور افترا محض ہے کہ لفظ ہجر حضرت عمرؓ نے کہا بخاری میں یہ حدیث سات جگہ آئی ہے مگر کہیں بھی یہ لفظ حضرت عمرؓ سے منقول نہیں۔ بلکہ قالوا جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "یہ لفظ لوگوں نے کہا مگر کس نے کہا؟

کسی بھی صحیح ومعتبر روایت میں اس کا نام مذکور نہیں البتہ شارحین نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے کسی نے لکھا یہ قول اس جماعت کا ہے جو تحریر لکھوانے کے حق میں تھی اور کسی نے لکھا کہ کچھ لوگ نومسلم تھے ان کا یہ مقولہ ہے غرض کہ حضرت عمرؓ کی طرف اس قول کو منسوب کرنا بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے چنانچہ ایک عرصہ سے مجتہدین شیعہ اس تلاش میں سرگرداں ہیں کہ کوئی ایسی روایت مل جائے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ لفظ حضرت عمرؓ کا مقولہ تھا مگر نہیں ملی اور انشاء اللہ العزیز قیامت تک یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے لفظ ہُجر کہا تھا۔ لہٰذا جب حضرت عمرؓ کا لفظ ہجر کہنا ثابت ہی نہیں تو ان پر الزام کیسا؟

دُوم ھَجَرَ، یَھْجُرُ باب نَصَرَ یَنْصُرُ کے وزن پر لازم ومتعدی دونوں طرح مستعمل ہے۔

(۱) جب یہ متعدی استعمال ہو تو ھجران سے مشتق ہوگا۔ اور اس کے معنی کسی چیز کے چھوڑ دینے کے ہوں گے۔

(۲) اور جب یہ لفظ لازم استعمال ہو تو اس وقت اس کے معنی بلا ارادہ بات کرنے کے ہوں گے خواہ نیند میں آدمی بات کرے یا غلبہ مرض کی وجہ سے بے اختیار زبان

سے جملے نکالے جس کو ہذیان کہتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں لفظ ہجر کے کیا معنی ہیں اور کون سے معنی یہاں اولیٰ ہیں تو حدیث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ یہاں ہجر کے معنی ہذیان کے نہیں بلکہ جدائی کے ہیں چنانچہ یہ لفظ بمعنی جدائی قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا ہے۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ط

اور عربی اشعار میں تو اس کثرت سے یہ لفظ جدائی اور فراق کے معنی میں آیا ہے کہ دوسرے معنی کی طرف ذہن ہی منتقل نہیں ہوتا۔

صراح وغیرہ کتب لغت میں ہے ہَجْرٌ ھجران جدائی کردن از مختصراً اسی لیے ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ اھجر فعل ماضی من الھجر بفتح الھاء وسکون الجیم والمفعول محذوف ای الحیاۃ اور لغات حدیث کے امام صاحب مجمع البحار نے لکھا ان معناہ ھجرکم رسول اللہ من الھجر ضد الوصل یعنی ھجر کے معنی یہاں جدائی کے ہیں۔

لہٰذا اھجر استفھموہ کا ترجمہ یہ ہوا کہ حضور سے پوچھو تو کیا جدائی کا وقت قریب آگیا ہے؟ یعنی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر لکھوانے کا ارادہ فرمایا اور چونکہ یہ تحریر اسی مرض میں لکھوانی چاہی جس میں آپ کا وصال ہوا تو حالات کو دیکھ کر صحابہ کرام کے قلوب پر ایک بجلی سی گری اور ان میں سے کسی نے کہا اھجر استفھموہ حضور سے دریافت تو کرو کیا جدائی اور فراق کا وقت قریب آگیا ہے کہ حضور آخری وصیت لکھوانا چاہتے ہیں) چنانچہ حاضرین میں سے کسی کا یہ کہنا کہ "استفھموہ"، حضور سے پوچھو تو؟) یہ پوچھنے کا مضمون صاف اس امر پر قرینہ ہے کہ یہاں ہجر بمعنی ہذیان نہیں ہے کیونکہ جس کو ہذیان ہو جائے اس سے پوچھنا کیسا؟

اظہارِ حقیقت الحق

المعروف

فارق بین الحق والباطل



مؤلف و مصنف علامہ ابو العطاء محمد اللہ دتہ قادری

باب نمبر۴

دفع الوسواس فی حدیث القرطاس

حدیث نمبر۱:

قَالَ بْنُ عَبَّاسٍ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيْسِ اِشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجْعُهٗ فَقَالَ ائْتُوْنِیْ اَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْ بَعْدَهٗ اَبَدًا فَتَنَازَعُوْ وَلَا يَنْبَغِیْ عِنْدَ نَبِیٍّ تَنَازُعٌ فَقَالُوْ مَا شَانُهٗ اَهَجَرَا اسْتَفْهِمُوْهُ فَذَهَبُوْا يَرُدُّوْنَ عَنْهُ فَقَالَ دَعُوْنِیْ اَنَا فِيْهِ خَيْرٌ مَّا تَدْعُوْنَنِیْ اِلَيْهِ وَ اَوْمَا هُمْ بِثَلَاثٍ قَالَ اَخْرِجُوْا الْمُشْرِكِيْنَ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَاَجِيْزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ اَجِيْزُهُمْ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ اَوْ قَالَ فَنَسِيْتُهَا

(صحیح بخاری شریف جلد ثانی باب مرض النبی کتاب المغازی)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا جمعرات کا دن اور کیسا عجیب وسخت دن کہ اس دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا درد بڑھ گیا۔ پس آپ نے سامان کتابت لانے کو کہا تا کہ

کچھ لکھ دوں۔ جس کے بعد بھی تم گمراہ نہیں ہو گے۔ حاضرین میں اختلاف ہو گیا۔ حالانکہ پیغمبر کی موجودگی میں نزاع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تو لوگوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حالت ہے؟ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کچھ بے ربط اور پریشان کلام نکالا ہے۔ لہذا آپ سے اُس کا مفہوم اچھی طرح معلوم کر لو۔ تو اس بنا پر انہوں نے دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا۔ (اور وضاحت چاہی) اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔ اور آپ نے انہیں تین وصیتیں کرنا شروع فرمائیں۔ (پہلی وصیت یہ کہ) مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو (دوسری یہ کہ) ایلچیوں کو اسی طرح انعام دینا جس طرح انعام دیا کرتا تھا۔ اور تیسری وصیت یا راوی حدیث سعید بن جبیر خاموش رہے اور بیان ہی نہ فرمائی یا بیان کی لیکن مجھے بھول گئی۔

حدیث نمبر ۲:

عَنْ عُبَيْدُ اللّٰهِ بِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بِنْ عَبَّاسٍ رضی الله عنهما قَالَ لَمَّا حُضِرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ فِيْ الْبَيْتِ رِجَالٌ فِيْهِمْ عُمَرُ بِنْ الْخَطَابِ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلُمَّ اَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوْ بَعْدَه' فَقَالَ عُمَرُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَ عَلَيْهِ الْوَجَعُ وَعِنْدَ كُمُ الْقُرْاٰنُ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ فَا خْتَلَفَ اَهْلُ الْبَيْتِ فَاخْتَصَمُوْ مِنْهُمْ مَّنْ يَقُوْلُ قَرِّبُوْا يَكْتُبُ لَكُمْ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَه' وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُوْلُ مَا قَالَ عُمَرُ فَلَمَّا اَكْثَرُوْا اللَّغْوَا وَالاِخْتِلَافَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَمَ قُوْمُوْا عَنِّيْ

ترجمہ: عبداللہ بن محمد اپنی اسناد کیساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کا وقت قریب آیا۔ اس وقت آپ کے در اقدس پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سمیت بہت سے افراد حاضر تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا میرے پاس سامان کتابت لاؤ۔ تاکہ تمہیں کچھ لکھ دوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سخت تکلیف میں ہیں اور تمہارے پاس اللہ کی کتاب قرآن ہے۔ وہ ہمیں کافی ہے۔ تو اس پر اہل بیت میں اختلاف رونما ہو گیا۔ ان میں سے ہمیں کافی ہے۔ تو اس پر اہل بیت میں اختلاف رونما ہو گیا۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ سامانِ کتابت آپ کے نزدیک کر دو تاکہ تمہارے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لکھ دیں۔ جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے اور کچھ دیگر حضرات نے وہی کہا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور ان دونوں گروہوں کا شور و اختلاف بڑھ گیا تو آپ نے انہیں چلے جانے کو فرمایا۔

(بخاری شریف جلد دوم کتاب الطیب قول المریض)

مذکورہ دونوں حدیثوں سے مندرجہ ذیل چند امور صراحتاً ثابت ہوئے جن کی وجہ سے شیعہ صاحبان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر حسب ذیل طعن کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قول آنحضرت کو رد کیا۔ حالانکہ آپ کا قول بحکم آیت کا مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ الا وحي يوحىٰ آپ کا قول سراسر وحی تھا۔ اور رد وحی کفر ہے۔

۲۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہذیان سے تعبیر کیا۔ آپ کی طرف سے ہذیان اور بدحواسی کی نسبت کی اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ

والسلام کی طرف ایسے الفاظ منسوب کرنا کمال گستاخی اور بے ادبی ہے بلکہ کفر کے نزدیک ہے۔

۳۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور رفع صوت کیا جو قرآن پاک کی اس آیت کے خلاف ہے۔

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ لہذا اس طرح بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے ادبی کے مرتکب ہوئے۔

۴۔ وصیت میں رکاوٹ ڈال کر حق اُمت تلف کیا۔ وصیت لکھی جاتی تو اُمت کی بھلائی ہوتی۔ یہ چار طعن ہیں جو حدیث قرطاس کے ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر کیے گئے کیونکہ بزعم شیعہ یہ تحریر انہی کی خلافت کے متعلق تھی۔ یعنی حضرت علی کی خلافت کے بارے

بخاری شریف میں یہ حدیث باختلاف الفاظ متعدد جگہ مذکور ہے اور یہ حدیث جتنے طرق سے مروی ہے سب میں آخری روای عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اُس وقت ان کی عمر تیرہ (۱۳) سال کی تھی۔ کیونکہ آپ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے۔ تیرہ سال کے نابالغ بچے کی اکیلی شہادت کب قابل قبول ہو سکتی ہے۔ واقعہ وہ ایسا جانکاہ سرکار دو عالم کی مرض الموت کا۔ جبکہ حضور کے آخری وقت میں تمام صحابہ کرام اور اہل بیت عظام رسول کا موجود ہونا ضروری ہے۔

ازمن محالات سے ہے کہ ایسے نازک وقت میں یہ سب لوگ موجود نہ ہوں پھر جب ان اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں کوئی بھی اس واقعہ کی روایت نہیں کرتا۔ تو ایک نابالغ بچے کی شہادت کس طرح قابل سماعت ہو سکتی

ہے۔اور چھوٹے بچوں کو وہاں جگہ ملنی مشکل ہوتی ہے۔تو روایت کے لحاظ سے یہ حدیث صرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مروی ہونے کے باعث جو اس وقت بالغ بھی نہ تھے ناقابل اعتبار ہے۔تو اس روایت کے بل پر شیعہ صاحبان کے اسقدر ہوائی قلعے تعمیر کر کے حضرت عمر جیسے ذیشان جلیل القدر خلیفہ کے خلاف الزام قائم کرنا کیا وقعت رکھتا ہے۔

امر اول:

واقعہ قرطاس کی یہ دو روایتیں اصل واقعہ کی تفصیل وتشریح کیلیے ہم نے نقل کی ہیں۔ اب جو امور اس سلسلہ میں قابل غور وفکر ہیں وہ بیان کیے جاتے ہیں۔

قارئین! تعصب سے بالاتر ہو کر بغور مطالعہ فرمائیں۔

ایتونی بقرطاس سے جو بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام لکھوانا چاہتے تھے۔ اُس کیا حیثیت تھی؟ کیا وہ کوئی ایسی بات تھی جو آپ کے فرائض نبوت میں سے تھی جس کے اظہار کے بغیر دین نامکمل رہ جاتا تھا۔حدیث قرطاس پر غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بات حضور لکھوانا چاہتے تھے۔اس کی یہ حیثیت نہ تھی۔

ا۔ یہ مسلمہ فریقین بات ہے کہ انبیاء کرام خدا کی طرف سے جن احکام کی تبلیغ کیلیے مبعوث ہوں جس بات کی تبلیغ اُن کا فرض نبوت ہو وہ اس میں قطعاً کسی حال میں کوتاہی نہیں کرسکتے۔فرمانِ خداوندی

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ

ترجمہ: اے رسول خدا کی طرف سے جو احکامات آئیں ان کی تبلیغ فرماؤ اگر ایسا نہ کیا تو تم نے اپنے فرض نبوت ادا نہ کیا اور اللہ تجھ کو بچائے گا لوگوں سے۔اس فرمان الٰہی سے ثابت ہوا

کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام احکام الٰہیہ کی تبلیغ میں کوتاہی نہیں فرما سکتے۔ اگر یہ تحریر دین کی نہایت اہم بات تصور ہوتی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ضرور اس کو لکھوا دیتے۔ خواہ کوئی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرتا۔

۲۔ بعض شیعہ صاحبان یہ کہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ائتونی بقرطاس فرمایا تو آپ کے اہل بیت اس ارشاد پر عمل کرنے کیلئے تیار تھے لیکن جب عمر رضی اللہ عنہ کا رویہ دیکھا تو ان سے ڈرتے ہوئے تعمیل نہ کر سکے اور سامان کتابت بارگاہ نبوی میں پیش نہ کر سکے۔

جواب یہ حیلہ شیعہ حضرات کا اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حضور انتہائی گستاخی اور بے ادبی کا پلندہ ہے۔ اہل بیت میں اس وقت شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی بنفس نفیس موجود تھے۔ تو گویا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ڈر سے سامان کتابت پیش نہ کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ مخلوق سے ڈر کر خالق اور اس کے محبوب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احکام و ارشادات کی اتباع چھوڑ دیا کرتے تھے تو کیا یہ نافرمانی تو نہیں؟

۳۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بوجہ (خوف عمر رضی اللہ عنہ) حضرت عمر کی موجودگی میں سامان کتابت نہ لا سکے تھے تو یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ جمعرات کے دن کا ہے اور اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام چار دن تک اس دار فانی میں قیام پذیر رہے اور سب لوگ اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ صرف دو شخص بارگاہ رسالت میں حاضر رہے۔ ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے فضل بن عباس رضی اللہ عنہ۔

(ملاحظہ ہو حیات القلوب باقر مجلسی)

حضرت امیر المومنین و فضل پسر عباس ازاں مرض از حضرت جدا نے شدند و پیوستہ در خدمت آنحضرت بودند

ترجمہ: حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بیماری کے دوران آپ سے جدا نہیں ہوئے اور لگاتار خدمت اقدس میں حاضر رہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال پیر کے دن ہوا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مدت میں جبکہ حضرت عمر نہ ہوتے۔ تحریر لکھوا لیتے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی لکھوا دیتے اگر یہ کہا جائے کہ معاذ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈر گئے تھے اور تحریر نہ لکھوا سکے۔ مگر یہ بات تو بے ایمان منکر قرآن کے دل میں ہی آسکتی ہے۔ اگر نبی کے متعلق ایسا مان لیا جائے تو پھر سارا دین ہی ناقابل اعتبار ہو جائیگا۔ کہ نامعلوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کتنے احکام الٰہیہ بوجہ خوف اُمت تک نہیں پونہچائے یہ بات کسی مسلمان کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ خاص کر وہ رسول جس نے کافروں بت پرستوں کے انبوہ در انبوہ میں توحید کا اعلان کیا۔ تلواروں کی جھنکاروں میں حق کا اظہار فرمایا۔

نوع انسانی کی ہدایت کی خاطر رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام کے پودے کو اپنے اقربا کے خون اور اپنے دانتوں کے خون اور اپنے خون کی قربانیوں سے آب پاشی کر کے سایہ دار بنایا۔ وہ ہستی حضرت عمر سے ڈر جائے کہ اپنی اُمت کیلئے ایسی تحریر نہ لکھوا سکے۔ یہ بات تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب جلیلہ کے بھی خلاف ہے۔ فرمان خداوندی

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ط

ترجمہ: اس آیت شریفہ نے بتلا دیا کہ جن پاک ہستیوں پر تبلیغ حق کا مدار ہے۔ وہ اللہ رب العزت کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ (پارہ ۲۲ سورہ احزاب حقیقت حال)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کہا تو اس

وقت حاضرین کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ کا اس بارے میں یہ خیال تھا۔ کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا درست اور برمحل ہے کیونکہ قرآن پاک ہمارے پاس موجود ہے۔ واقعہ قرطاس سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُم آج تمہارا دین کامل بلکہ اکمل ہو گیا ہے۔ تو پھر حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایسی نازک حالت شدت مرض میں تکلیف میں ڈالنا شیدایان ذات والا کو مناسب نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مرض موت کی حالت ایسی ہے کہ آپ سخت تکلیف میں ہیں۔ اور اس شدید تکلیف میں آپ نے جو کاغذ قلم منگوانے کا ارشاد فرمایا ہے وہ محض اُمت پر شفقت کی خاطر ہے۔ لہذا جب آپ کی تعلیمات ہمارے سامنے ہیں اور اُن میں آپ نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ تو ایسے تکلیف دہ وقت میں آپ کو مزید تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ کی تکلیف میں اضافہ گوارہ نہ تھا۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا سا موقعہ پر قَدْ غَلَبَ عَلَیْهِ الْوَجْعُ وَعِنْدَکُمْ وَالْقُرْآنُ اور حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰهِ کے الفاظ کہنا دراصل ان کے عشق ومحبت اور نیک مشورہ کے غماز ہیں۔

قَدْ غَلَبَ عَلَیْهِ الْوَجْعُ میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درد کا احساس جس طرح عیاں ہے وہ ہر صاحب ذوق سلیم جانتا ہے۔ اور وَعِنْدَکُمُ الْقُرْآنُ کہنا دراصل اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کیطرف اشارہ کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عمر کے یہ الفاظ سنے اور ان سے کوئی مخالفت نہ سمجھی بلکہ مزاج نبوت کی صحیح ترجمانی سے آپ مطمئن ہو گئے۔ تو آپ نے دوبارہ سامان کتابت طلب فرمانے کا حکم نہیں دیا۔

دوسرا گروہ وہ تھا جن کا خیال تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔ کیونکہ ائتونی بقرطاس کے الفاظ اپ کی زبان اقدس سے بطور ہذیاں نہیں نکلے۔

توجب آپ کا تکلم عام حالت کی طرح قابل اعتبار وحجت ہے تو اس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ تو اس دوسرے گروہ کے نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر لفظ ''اَھَجَرَ'' کا مفہوم صحیح واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ لفظ اُن حضرات نے کہا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کر رہے تھے۔ گویا وہ دراصل یہ کہہ رہے تھے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حسبُنا کتاب اللہ کہہ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان اقدس سے نکلے لفظ پر عمل کو چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ آپ کی زبان اقدس سے یہ الفاظ بطور ہذیاں سرزد نہیں ہوئے تھے اس وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات پر یہ الزام دھرے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہذیان کی نسبت کی تو یہ الزام دراصل ہٹ دھرمی کا آئینہ دار ہوگا۔

نیز اَھَجَرَا ۔ کا معنی ہذیان کرنا شیعہ حضرات کی سخت بے علمی کے دلیل ہے۔ معنی عبادت اَھَجَرَا سْتَفْهِمُوْهُ یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کیا حال ہے۔ کیا آپ دنیا سے ہجرت فرمانے لگے ہیں آپ سے دریافت تو کرو۔ اگر اَھَجَرَا کا معنی ہذیان کئے جائیں تو اِسْتَفْهِمُوْهُ' کا معنی صحیح نہیں ہوسکتا۔

کیونکہ جس شخص کی نسبت یہ گمان ہو کہ اس کے حواس درست نہیں اور ہذیان (بہکی باتیں) کہہ رہا ہے تو کوئی پاگل بھی یہ نہیں کہے گا۔ کہ اس سے پوچھو تو سہی کہ تمہارے اس کلام کا کیا مطلب ہے۔ کیا مجنوں کو مجنوں یقین کرنے کے بعد بھی کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے۔ کہ بتلاؤ تو سہی کہ تمہاری اس بڑ کا کیا مطلب ہے۔ الغرض لفظ اِسْتَفْهِمُوْهُ اہل فہم کو سمجھنے سمجھانے کیلئے کافی ہے۔ دوسرے یہ محض افترا اور کذب بیانی ہے۔ کہ لفظ ھجر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ بخاری شریف میں یہ حدیث سات جگہ آئی ہے مگر کہیں بھی یہ لفظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

سے منقول نہیں بلکہ قالو جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ لوگوں نے کہا مگر کس نے کہا؟ کسی بھی صحیح روایت میں اس کا نام مذکور نہیں۔ البتہ شارحین نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے۔ کسی نے لکھا یہ قول اُس جماعت کا ہے جو تحریر لکھوانے کے حق میں تھی۔ کسی نے بالکل بے بنیاد اور بے اصل اور علمی مفلسی کی دلیل ہے جبکہ حدیث میں فَتَنَازَعُوْ. فَاختَصَمُوْ. قَالُوْ وغیرہ سب جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس تنازع و جھگڑا اور رفع صوت رد قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تلفیٔ اُمت میں جملہ حاضرین حجرہ جن میں علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور بنو ہاشم وغیرہ بھی تھے۔ سب یکساں شریک ہیں۔ اگر قصور ہے تو سب کا نہیں تو کسی کا بھی نہیں۔

حدیث میں فَقَالُوْ مَاشَانُهٗ اَهَجَرَا اِسْتَفْهِمُوْهُ' لکھا ہے۔ یعنی حاضرین نے یہ لفظ کہا پھر اس جمع کے صیغے کا فاعل واحد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو قرار دینا شیعہ حضرات کی بے انصافی یا بے علمی کی دلیل ہے۔ کیا وہ تحریر ضرور تھی۔

اس موقع پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ تحریر لکھوانے کا ارادہ وحی خداوندی کے ماتحت فرمایا تھا۔ یا اپنے اجتہاد کے ماتحت فرمایا تھا۔ کیونکہ اگر آپ کا یہ ارادہ وحی خداوندی کے مطابق ہوتا۔ تو تحریر لکھوانا آپ کا فرض نبوت قرار پاتا اور نبی اپنے فرض نبوت میں کوتاہی نہیں کرسکتا۔ لہذا آپ حکم الٰہی کے ماتحت بہر صورت تحریر لکھواتے۔ حاضرین یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو صاف صاف فرمادیتے کہ میری بیماری کی تکلیف اس تحریر کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تم میری تکلیف کے پیش نظر تحریر نہ لکھوانے کا مشورہ دے رہے ہو۔ یہ تحریر تو حکم خداوندی ہے بہر حال بہر صورت لکھوائی جائیگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضور اس کے بعد چار روز تک سلامت رہے اور اس دوران افاقہ بھی ہوتا رہا۔ لیکن پھر بھی کاغذ قلم

دوات طلب فرمائی اور نہ کوئی تحریر کی۔

دوسرا ثبوت اس حدیث کے اندر موجود ہے کہ ان دو فریق میں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس فریق کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کی تکلیف نہ دینا چاہتے تھے۔ اور دوسرے فریق کو ڈانٹ دیا کہ مجھے بے وجہ تکلیف نہ دو۔ فَذَهَبُوْا يَرُدُّوْنَ عَنْهُ فَقَالَ دَعُوْنِىْ اَنَا فِيْهِ خَيْرٌ مِّمَّا تَدْعُوْنَنِىْ اِلَيْهِ

حاضرین نے آپ سے دوبارہ وضاحت چاہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے چھوڑ دو میں جس حال میں ہوں اس سے بہتر ہے۔ جس کی طرف تم مجھے مدعو کرتے ہو۔ یعنی تم مجھے تحریر کرنے کیلئے بار بار مجبور کرتے ہو یہ مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ الفاظ حدیث شیعہ کے مدعا کے سخت خلاف ہیں۔ جن سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ تحریر کرنا نہ چاہتے تھے۔ تو شیعہ صاحبان اس حدیث سے کس طرح دلیل پکڑ سکتے ہیں۔ کہ خلافِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی وہی وصیت لکھنا مقصود تھی۔ ممکن ہے کہ خلافِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا لکھنا منظور ہو اور چونکہ بخاری شریف مسلم شریف کی حدیثوں سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق تحریر لکھوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔

اِدْعِىْ لِىْ اَبَابَكْرٍ اَبَاكِ وَاَخَاكِ حَتّٰى اَكْتُبَ كِتَابًا فَاِنِّىْ اَخَافُ اَنْ يَّتَمَنّٰى مُتَمَنٍّ وَيَقُوْلُ قَائِلٌ اَنَا اَوْلٰى وَيَاْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَابَكْرٍ

ترجمہ: ام المومنین حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری میں فرمایا بلا تو اپنے باپ ابو بکر کو اور اپنے بھائی کو تا کہ میں ایک کتاب لکھ دوں۔ میں

ڈرتا ہوں کوئی آرزو کرنے والا آرزو نہ کرے۔ (خلافت کی) اور کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ میں خلافت کا زیادہ حقدار ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ انکار کرتا ہے اور مسلمان بھی انکار کرتے ہیں سوا ابوبکر کے اور کسی کی خلافت سے۔

(مسلم شریف جلد ششم باب من فضائل ابی بکر الصدیق)

اور چونکہ بنو ہاشم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان معلوم تھا کہ امامت نماز پر بھی آخری وقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مامور کیا گیا۔ اس لئے کاغذ، قلم، دوات، پیش کرنے میں اہل بیت نے تامل کیا۔ حدیث میں اختلاف اور شوروغل کو اہل بیت کی طرف سے منسوب کیا گیا ہے۔ (الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں حدیث بخاری کے فَاخْتَلَفَ اَهْلُ الْبَيْتِ فَاخْتَصَمُوْا اہل بیت نے اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے) پھر تعجب ہے اور تو سب جگہ اہل بیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسن پاک اور حسین پاک مراد لئے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اہل بیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اُن کے طرفدار اس مراد لئے جا کر اختلاف اور جھگڑنے کا ان ہی کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ یاللعجب غرض الزامات مذکورہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا حقائق کے خلاف اور سخت بے انصافی ہے۔

رفع صوت یعنی شوروغل کرنے کا الزام صرف اور صرف حضرت عمر کو قرار دینا انتہائی زیادتی اور ہٹ دھرمی ہے۔ حدیث پاک کے الفاظ فَاَكْثَرُوْا اللَّغْوَا اور فَتَنَازَعُوْا میں جواز روئے لغت عرب فرد کیلئے نہیں بلکہ جمع کیلئے ہے۔

غور کا مقام ہے کہ شوروغل اور بلند آوازی ایک آدمی سے واقع ہونا خلاف واقعہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ شوروغل کے ارتکاب میں ایک جماعت شریک تھی اور وہ وہی جماعت

تھی۔ جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول حسبُنا کتابُ اللّٰہِ میں اختلاف کیا اور ان کی باتوں کا جواب یا اپنے حق میں دلائل دینے والی دوسری جماعت کی گفتگو سے یہ ماحول پیدا ہوا۔ یعنی کچھ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی تائید اور کچھ تردید کرتے کرتے بلند آوازی کی حد تک پہنچ گئے۔ لہذا ہر دو فریق کی باہم بلند آوازی کو صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح منسوب کر دینا سراسر زیادتی اور بے انصافی و بے علمی کی دلیل ہے۔ دیگر جو قرآنی حکم ہے لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ہم کلامی کے وقت تم اپنی آواز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو۔ لیکن جب آپ سے ہمکلامی نہ ہو اور شریک گفتگو نہ ہوں تو حاضرین باہمی گفتگو کرتے وقت بلند آواز تک پہنچ جائیں تو ایسی بلند آوازی اس ممانعت میں داخل نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ عِنْدَ النَّبِيِّ کے الفاظ ہوتے۔ جس کا مفہوم یہ ہوتا۔ اے ایمان والو! تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں باہمی گفتگو کرتے وقت بلند آواز سے کلام نہ کرو۔ معلوم ہوا کہ زیر بحث بلند آوازی مذکورہ قرآنی حکم میں داخل نہیں۔

رد قول رسول ﷺ:

اگر رد قول رسول کی ذمہ داری زیادہ تر اہل بیت کے ذمے عائد ہوتی ہے۔ جیسا کہ دلائل قویہ قطعیہ سے ہم ثابت کر چکے ہیں۔ لیکن از راہ ضد و تعصب اگر اس جرم کا مجرم حضرت عمر ہی کو گردانتا ہے تو اقتضائے عشق و محبت اور نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اس لئے یہ داخل جرم نہیں اور اگر ہر حالت میں خواہ کسی نیت سے ہو رد قول جرم ہے تو اس جرم کے مرتکب جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ متعدد دفعہ ہو چکے ہیں۔ چنانچہ شیعہ حضرات کے رئیس المفسرین مجتہد اعظم ملا باقر مجلسی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ صلح حدیبیہ کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ لکھنے کا حکم

علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو دیا۔ جب حضرت علی نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تحریر کیے تو کفار نے کہا کہ آپ صلی اللہ کا نام رسول ہونا ہم نہیں مانتے لہذا اس کی بجائے محمد بن عبداللہ لکھو۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا محمد رسول اللہ کے الفاظ مٹا کر محمد بن عبداللہ ہی لکھ دو۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لفظ رسول اللہ مٹانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ حضور میں آپ کے نام کے ساتھ اس لفظ کو لکھ کر مٹا نہیں سکتا۔ علامہ مجلسی کے الفاظ گفت یا علی محو کن آں را محمد بن عبداللہ بنویس۔ چنانچہ او میگویند حضرت امیر رضی اللہ عنہ فرمود کہ من نام ترا از پیغمبری ہرگز محو نخواہم کرد۔ پس حضرت بدست مبارک خود آں را محو کرد۔

ترجمہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی المرتضیٰ کو فرمایا کہ "محمد رسول اللہ" کے الفاظ مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھ دو۔ جس طرح وہ کہہ رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ میں آپ کے نام مبارک سے پیغمبری کی صفت ہرگز نہیں مٹاؤں گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست اقدس سے اس کو مٹایا۔ (صفحہ ۲۲۰ حیات القلوب جلد چہارم)

اگر سامان کتابت لانے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انکاری تھے۔ تو محمد رسول اللہ کے حکم کے بعد رسول مٹانے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی پر زور انکار کر دیا تو جو فتویٰ پہلے انکار پر دیتے ہو۔ وہی فتویٰ دوسرے انکار پر بھی ہوگا۔ اگر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ انکار کی توجیہ کر کے اسے محبت وعظمت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت گردانتے ہیں تو ہمارا بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہی دعویٰ ہے۔ اب شیعہ حضرات انصاف سے بتائیں کہ اگر جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بتقاضائے عقیدت ومحبت سے رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیل سے انکار کرنے پر مجرم نہیں بن سکتے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیوں الزام دیا جاتا ہے جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آپ کی تکلیف میں اضافہ گوارہ نہ تھا۔

قَدْ غَلَبَ عَلَيْهِ الْوَجْعُ وَعِنْدَكُمُ الْقُرْآنُ اور حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کے الفاظ کہنا دراصل ان کے عشق ومحبت اور نیک مشورہ کے غماز ہیں۔ حالانکہ وہاں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت اور نیک مشورہ کے غماز ہیں۔ حالانکہ وہاں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرز عمل سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا اور یہاں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلاف رائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ لیکر خود اُس لفظ کو جس کے مٹانے سے جناب علی المرتضیٰ نے انکار کیا تھا۔ قلمزن کر دیا۔

۲۔ عَنْ مُحَمَّدُ بِنْ حَنِيْفِيَه عَنْ اَبِيْهِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّهُ قَالَ قَدْ اَكْثَرَ النَّاسُ عَلٰى مَارِيَةِ الْقِبْطِيَةِ............ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ يَصْرِفُ عَنَّا الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ

ترجمہ: محمد بن حنفیہ اپنے پدر بزرگوار علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے ماریہ رضی اللہ عنہ قبطیہ اُم ابراہیم بن نبی علیہ السلام پر نسبت اُن کے چچازاد بھائی قبطی کے اعتراض کیا کہ تلوار لو وہ اگر تجھے اس کے پاس ملے اس کو قتل کر دو۔ جب میں اُس قبطی کے پاس گیا اور اسے میرا ارادہ سمجھا تو ایک کھجور کے درخت پر چڑھ کر نیچے سر کے بل گر پڑا اور پاؤں اوپر کی طرف اٹھا لیے۔ میں نے اسے دیکھا وہ صاف (مقطوع النسل) مردوں کی اس میں کچھ بھی علامت نہیں ہے۔ بس میں نے تلوار میان میں کر دی اور واپس ہو کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس گیا اور ماجرا بیان کیا۔ تو حضور فرمانے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہم اہل بیت کو رجس سے پاک کیا ہے۔ شریف مرتضیٰ (علم الھدیٰ نے) اپنی کتاب درا لغرر میں نقل کیا اور ترجمہ مقبول شیعی بر حاشیہ صفحہ ۶۹۹ میں بھی یہ واقع درج ہے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حکم رسول کی تعمیل نہ کی

اور قبطی کو تلوار سے قتل نہ کیا۔ تو جب اس صورت میں جناب امیر رضی اللہ عنہ پر نافرمانی رسول کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ تعلیم حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک بے گناہ کا قتل ہے۔ جو آپ کو گوارہ نہ ہوا۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کے متعلق شیعہ صاحبان اور اہل سنت کو علم ہے کہ وصال مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موقعہ پر وفور عشق وغم کے صدمہ سے نڈھال ہو کر ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ تلوار بے نیام کر لی اور فرمانے لگے جو یہ کہے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مر گئے ہیں میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضرت ابوبکر آئے اور آ کر خطاب کیا اور یہ آیہ کریمہ تلاوت فرمائی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

ترجمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بوجہ عشق ومحبت رسول کے ایسی نازک حالت اور شدت مرض میں تکلیف میں ڈالنا گوارہ نہ کیا۔ مصلحت ایسی حالت میں یہی سمجھی اور حسبنا کتاب اللہ کہہ کر اپنی رائے پیش کر دی تو انہوں نے کیا قصور کر دیا۔

نوٹ: اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہی اہل بیت ہیں۔ چنانچہ ماریہ قبطیہ کے حق میں یہ لفظ استعمال فرمایا:

اب حدیث قرطاس کی ساری بحث کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ یہ حدیث صرف عبداللہ بن عباس کے مروی ہونے کے باعث جو اسوقت بالغ بھی نہ تھے ناقابل اعتبار ہے۔

۲۔ ائتونی بقرطاس اگر صیغہ امر ہے۔ اگر وجوب کیلئے ہوتا تو حضرت عمر کا اس کی مخالفت کرنا معاذ اللہ مترادف کفر ہو سکتا تھا۔ اگر اس وجوب کیلئے مانا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل میں رکاوٹ ڈالی اور آپ کو اللہ کے حکم پر عمل کرنے سے روک دیا تو جب

ایسا ہوا تو فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَه‘ تو تم نے اپنا فرض نبوت ادا نہ فرمایا۔ کے مطابق آپ نے اللہ کے حکم کی تبلیغ نہ فرمائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حکم سے روک کر صرف اپنی ہی نقصان نہیں کیا۔ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگانے کا راستہ ہموار کر دیا۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ اللہ کا حکم لوگوں تک نہ پہنچا کر ”حق رسالت“ ادا نہیں کیا تو جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے احکام کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائی وہ مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ دوسرے اسی حدیث قرطاس میں آتا ہے کہ حاضرین نے دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سامان کتابت لے آئیں۔ تو آپ نے فرمایا مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔ میری یہ حالت اس سے بہتر ہے۔ جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔ آپ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ سامان کتابت طلب کرنا دراصل امر الٰہی نہ تھا بلکہ محض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور ہمدردی کا آئینہ دار تھا۔ جس طرح کوئی شخص الوداعی لمحات میں کسی بات کی بار بار تاکید کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ائتونی کا صیغہ امر استحبابی تھا۔ وجوب کیلئے اور من جانب الٰہی نہیں تھا۔

۳۔ حدیث میں جو لفظ اَھَجَرَ استفھموہ آیا ہے شیعہ حضرات کی لئے ھجر کے معنی یہاں صرف ہذیان کے ہیں اور یہ لفظ حضرت عمر نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید توہین اور سنگین ترین گستاخی کی ہے۔

جواب: یہ غلط ہے کہ لفظ ھجر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ بخاری میں یہ روایت سات جگہ آئی ہے مگر کہیں بھی یہ لفظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول نہیں بلکہ قالوا جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے (یہ لفظ لوگوں نے کہا غرضیکہ حضرت عمر کی طرف سے اس قول کو

منسوب کرنا بالکل بے اصل اور بے بنیاد اور افتراء محض ہے۔ بہت عرصہ سے شیعہ مجتہدین اس تلاش میں سرگرداں ہیں کہ کوئی ایسی روایت مل جائے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ لفظ ھجر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ تھا۔ مگر نہیں ملی اور انشاء اللہ العزیز قیامت تک یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لفظ ھجر کہا تھا۔ جب حضرت عمر فاروق کا لفظ ھجر کہنا ہی ثابت نہیں تو ان پر الزام کیسا؟ لفظ ھَجَرَ یَھْجُرُ باب نَصَرَ یَنْصُرُ کے وزن پر لازم و متعدی دونوں طرح مستعمل ہے۔ جب یہ متعدی استعمال ہو تو ھجران سے مشتق ہوگا۔ اس کے معنے کسی چیز کے چھوڑ دینے کے ہوں گے۔ اور جب یہ لفظ لازم استعمال ہو تو اس وقت اس کے معنی بلا ارادہ بات کرنے کے ہوں گے۔ خواہ نیند میں آدمی بات کرے۔ یا غلبۂ مرض کیوجہ سے بے اختیار زبان سے جملے نکالے اس کو ہذیان کہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں ھَجَر کے معنی ہذیان کے نہیں بلکہ جدائی کے ہیں چنانچہ یہ لفظ بمعنی جدائی قرآن مجید سورۃ مزمل میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا اور عربی اشعار میں تو اس اکثر سے یہ لفظ جدائی اور فراق کے معنی میں آیا ہے۔ کہ دوسرے معنی کی طرف سے ذہن ہی منتقل نہیں ہوتا۔ صراح وغیرہ کتب لغت میں ھَجْر ھجران جدائی کردن از نَصَرَ آیا ہے۔ چونکہ یہ تحریر اس وقت لکھوانی چاہی جس میں آپ کا وصال ہوا۔ تو یہ حالات دیکھ کر صحابہ کرام کے قلوب پر ایک بجلی سی گری اور ان میں سے کسی نے کہا ھَجَرَا سْتَفْهِمُوْهُ' حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت تو کر لو کیا جدائی اور فراق کا وقت قریب آ گیا ہے کہ (حضور آخری وصیت لکھوانا چاہیت ہیں) چنانچہ حاضرین میں سے کسی کا یہ کہنا کہ استفھموہ (حضور سے پوچھو تو؟) یہ پوچھنے کا مضمون صاف اس امر پر قرینہ ہے کہ یہاں ہجر بمعنی ہذیان نہیں ہے کیونکہ جس کو ہذیان ہو جائے اس سے پوچھنا کیسا؟

۴۔ شور وغل کا الزام:

لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ہمکلامی کے وقت تم اپنی آواز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بلند نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ دوران گفتگو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلند آوازی کی ممانعت آئی ہے۔ اگر آپ شریک گفتگو نہ ہوں تو حاضرین آپس میں گفتگو کرتے وقت بلند آوازی تک پہنچ جائیں تو ایسی بلند آوازی اس ممانعت میں داخل نہیں اگر ایسا ہوتا۔ لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ عِنْدَ النَّبِیِّ کے الفاظ آتے۔ جس کا یہ معنی ہوتے اے ایمان والو! تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں باہمی گفتگو کرتے وقت بلند آواز سے کلام نہ کرو حالانکہ یہ الفاظ نہیں۔ ثابت ہوا کہ زیر بحث بلند آوازی مذکورہ حکم قرآنی میں داخل نہیں۔ دوسری بات یہ بھی غور طلب ہے کہ شور وغل کیوجہ سے مجرم صرف حضرت عمر کو قرار دینا۔ انتہائی ہٹ دھرمی اور زیادتی ہے۔ حدیث پاک کے الفاظ فَاَکْثَرُوا اللَّغْوَ او فَتَنَازَعُوْا میں جواز روئے لغت عرف فرد واحد کیلئے نہیں بلکہ جمع کیلئے ہیں۔ بلکہ حدیث پاک کے الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں۔

فَاخْتَلَفَ اَهْلُ الْبَیْتِ فَاخْتَصَمُوْا

اہل بیت نے اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے۔ پھر تعجب ہے۔ اور تو سب جگہ اہل بیت سے حضرت علی، سیدہ فاطمہ، اور حسنین رضوان اللہ علیہ اجمعین مراد لئے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اہل بیت سے حضرت عمر اور ان کے طرفداراں مراد لئے جا کر۔ اختلاف اور جھگڑے کا ان کو ہی ذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ غرض الزامات مذکورہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کرنا شیعہ صاحبان کی سخت بے انصافی ہے۔ جبکہ حدیث پاک میں ہے۔ تَنَازَعُوْا . اِخْتَصَمُوْا.

قَــالُوْ سب جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اور اس تنازعہ شور جھگڑا اور رفع الصوت رد قول رسول حق تلفی اُمت میں جملہ حاضرین حجرہ جن میں حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ اور بنو ہاشم بھی تھے۔ سب یکساں شریک ہیں۔ اگر قصور ہے تو سب کا اگر نہیں تو کسی کا بھی نہیں۔

۵۔ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سامان کتابت یعنی کاغذ۔ قلم۔ دوات اسلئے طلب فرمایا کہ حضرت علی کی خلافت بلافصل تحریر فرمادیں۔ حالانکہ اس کی تصریح کسی معتبر اور صحیح روایت سے نہیں ملتی لہذا یہ ایک محض دعویٰ ہے جو بلا دلیل ہے۔ البتہ اسی بخاری و مسلم اور مشکوٰۃ باب مناقب ابوبکر کی حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق تحریر لکھوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جس کا ذکر صفحہ ۱۶۳ میں ہو چکا ہے۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت بلافصل کے بارے اس لئے تحریر کا ارادہ ترک کردیا کہ آنحضرت عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ میرے وصال کے بعد لوگ حضرت علی المرتضٰی کو خلیفہ نہیں بنائیں گے۔ اور تقدیر الٰہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ یہ منصب میرے بعد ابوبکر صدیق کو دیا جائیگا۔ تو پھر یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان کتابت اس لئے طلب فرمایا کہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی خلافت تحریر فرمادیں۔ قبل ازیں ایک مرتبہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اس معاملہ میں سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو واضح پیش گوئی فرمائی تھی۔

اِنَّ اَبَـابَكْرٍ يَلِي الْخَلَافَةَ مِنْ بَعْدِيْ ثُمَّ بَعْدَهٗ اَبُوْكِ فَقَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (تفسیر صافی صفحہ ۱۶ے سورہ تحریم)

ترجمہ: ضرور بالضرور میرے بعد خلافت کا والی ابوبکر ہوگا۔ اس کے بعد تیرا باپ (حضرت عمر) خلیفہ ہوگا۔ حضرت حفصہ نے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ آپ کو اس بات

کی خبر کس نے دی ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ علیم وخبیر نے خبر دی ہے۔ شیعہ کی معتبر کتاب تفسیر صافی صفحہ نمبر ۵۲۳)

تفسیر فرات کوفی میں منقول ہے کہ جب کسی نے حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے پوچھا فَمَا تَاوِیلُ قَوْلِهٖ (لَیْسَ لَکَ مِنَ الاَمْرِ شَیْیٌ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص) حرص اَنْ یَّکُوْنَ الاَمْرُ لِاَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (ع) مِنْ بَعْدِهٖ فَابَی اللّٰه

(تفسیر فرات کوفی مطبوعہ حیدریہ نجف)

ترجمہ: آپ کو اس امر میں کوئی اختیار نہیں کی تفسیر کے سوال میں کے جواب میں امام باقر رضی اللہ عنہ نے سائل کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ آپ کے بعد امر خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملے۔ لیکن اللہ رب العزت نے اس سے انکار کر دیا۔ دونوں مذکورہ حدیثوں سے ثابت ہوا کہ خلافت صدیقی عند اللہ کا مقدر ہو چکی تھی۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم خلیفہ بلا فصل نہیں ہونگے۔ (الارشاد شیخ مفید)

وَبَقِیَ عِنْدَهُ الْعَبَّاسُ وَالفَضْلُ بِنْ عَبَّاسٍ وَعَلِیُّ بِنْ اَبِیْ طَالِبٍ وَاَهْلُ بَیْتِهٖ خَاصَّةِ (ء) فَقَالَ لَهٗ الْعَبَّاسُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ یَّکُنْ هٰذَا الْاَمْرُ فِینَا مُسْتَقِرًّا مِنْ بَعْدِکَ فَبَشِّرْنَا وَاِنْ کُنْتُ تَعْلَمْ اَنَّا نُغْلَبُ عَلَیْهِ فَاَقِضِ بِنَا فَقَالَ اَنْتُمُ الْمُسْتَضْعَفُوْنَ مِنْ بَعْدِی وَصَمَتَ فَنَهَضَ الْقَوْمُ وَهُمْ یَبْکُوْنَ قَدْ یَئِسُوْا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ

ترجمہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس سے سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد صرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ فضل بن عباس، حضرت علی المرتضیٰ اور آپ کے اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین رہ گئے۔ تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! اگر

آپ کے انتقال کے بعد معاملہ خلافت ہمارے بارے میں مقدر ہو چکا ہو۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس کی خوشخبری سنائیں اور اگر آپ جانتے ہیں تو ہم امر خلافت کے حصول میں کامیاب نہ ہونگے اور لوگ ہم پر زبردستی کرینگے۔تو آپ ابھی اس حق کی وضاحت فرماتے ہوئے۔قطعی فیصلہ فرما دیجئے۔یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کہ تم لوگ میرے بعد کمزور ہو جاؤ گے۔یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔حاضرین یہ سن روتے ہوئے اٹھ گئے اور امر خلافت میں اپنے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نا امید ہو گئے۔شیخ مفید کی اس عبارت سے تمام شبہات کا ازالہ ہو گیا۔

کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سامان کتابت منگوانے پر کیا لکھوانا چاہتے تھے۔غور طلب مقام ہے۔اگر سامان کتابت منگوانے کی یہ غرض ہوتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل قلمبند کر دیں جس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں نے رکاوٹ کھڑی کر دی۔تو جب رکاوٹ ڈالنے والے سب چلے گئے ماحول پر سکون ہو گیا۔اور خلافت کے خواہاں اور حضرت علی اوران کے چند رفقاء رہ گئے۔انہوں نے بارگاہ رسالت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل کا مطالبہ بھی کر دیا۔مگر رسالت مآب نے خلافت بلا فصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقدر میں ہونے کی نفی کر دی۔تو اظہر من الشمس معلوم ہو گیا کہ سامان کتابت لانے کا حکم کرنا۔حضرت علی کی خلافت بلافصل تحریر کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی غرض کوئی اور ہو گی۔اللہ کرے شیخ مفید کا فیصلہ ان کیلئے حق قبول کرنے کا سبب بن جائے۔

(الارشاد للشیخ مفید صفحہ ۹۹ فی طلب رسول اللہ بدوات وکتف)

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور ہو گئے مختلف گروہ، آپ کو ان سے کوئی تعلق نہیں

مذہب شیعہ

از

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب قدس سرہ العزیز

مع

تحفہ حسینیہ

حصہ دوم

علامہ ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

اہل السنۃ پبلی کیشنز دینہ ضلع جہلم

تتمہ بحث قرطاس

پہلے قرطاس طلب کئے جانے کے متعلق اہل السنت کی انتہائی معتبر و مستند کتب میں مروی و منقول روایات ملاحظہ فرمائیں:

۱- قلت یا بن عباس ما یوم الخمیس قال اشتد برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وجعہ فقال ایتونی بکتف اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا فتنازعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا ما شانہ اھجر استفھموہ فذھبوا یردون علیہ فقال دعونی ذرونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ فامرھم بثلاث فقال اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم فسکت عن الثالثۃ اوقالھا فنسیتھا قال سفیان ھذا من قول سلیمان (متفق علیہ مشکوٰۃ باب وفات النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا خمیس کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد سخت ہوگیا، تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس شانہ کی ہڈی لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی تحریر لکھوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، تو صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہوئے یہ مناسب نہیں ہوتا، تو انہوں نے حجرۂ مبارکہ میں موجود حضرات باہم نزاع و اختلاف کرنے لگے جبکہ حضور نبی اکرم کہا، آپ کا کیا حال ہے کیا آپ بے مقصد اور غیر ضروری گفتگو فرما رہے ہیں-؟ آپ سے اس کو سمجھ لو- وہ جب آپ سے دوبارہ پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو اور اپنے حال پر رہنے دو، کیونکہ میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے، جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، تو آپ نے انہیں تین امور کا حکم دیا، مشرکین کو

جزیرۂ عرب سے نکال دینا، آنے والے وفود کو اسی طرح انعامات اور تحائف دے کر رخصت کرنا جیسے کہ میں دیا کرتا تھا۔ تیسری بات سے سکوت فرمایا یا میں اس کو بھول گیا۔ سُفیان فرماتے ہیں کہ یہ قول سلیمان ابن احول کا ہے جس نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے۔ متفق

٢- عن ابن عباس قال لما حضر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وفی البیت رجال فیھم عمر بن الخطاب قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ھلموا اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ فقال عمر قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبکم کتاب اللّٰہ فاختلف اھل البیت واختصموا فمنھم من یقول قربوا یکتب لکم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ومنھم من یقول ما قال عمر فلما اکثروا اللغط والاختلاف قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قوموا عنی قال عبید اللّٰہ وکان ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ ما حال بین رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وبین ان یکتب لھم ذالک الکتاب لاختلافھم ولغطھم۔ متفق علیہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقتِ وصال قریب آگیا اور حجرۂ مبارکہ میں چند آدمی موجود تھے جن میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس (لکھنے کا سامان) لے آؤ، میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھوں؛ جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تحقیق آپ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن مجید ہے، لہٰذا تمہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے تو گھر میں موجود لوگوں نے باہم اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے۔ بعض کہتے تھے لکھنے کے لیے ضروری اشیاء مہیا کرو۔ آپ تمہارے لیے لکھیں اور بعض اس طرح کہتے تھے جیسے حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے کہا تھا۔ جب ان کا اختلاف و نزاع زیادہ ہو گیا اور شور بڑھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ (اور دور جا کر بحث و مباحثہ کرو)۔ عبید اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے، بہت بڑی مصیبت اور پریشان کن بات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس تحریر کے درمیان حائل ہو گئی بسبب ان کے اختلاف اور شور کے۔

اقول: بخاری شریف اور مسلم شریف کی متفق علیہ روایات سے چند امور واضح ہو جاتے ہیں، جن کا ذہن نشین رکھنا ازبس ضروری ہے۔

۱۔ یہ واقعہ خمیس کا ہے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال شریف سوموار کو ہوا، گویا تین دن رات مکمل درمیان میں گزرے اور خمیس کا بقیہ حصہ اور سوموار کی رات اور دن کا کچھ حصہ، لیکن پھر آپ نے اس حکم کا اعادہ نہ فرمایا اور کسی قریبی رشتہ دار کو بھی سامان کتابت لانے کا حکم نہ دیا اور نہ ہی انصار کو جو فی الواقع کامل انصار تھے اور صاحب ایثار اور جاں نثار غلام۔

۲۔ جب صحابہ کرام علیہم الرضوان نے تحقیق کے لیے اور حتمی ارادہ معلوم کرنے کے لیے دوبارہ عرض کیا، تو فرمایا، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے، جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ اگر اس امر کا تعلق فرائض رسالت سے تھا، تو اس کا بیان نہ فرمانا اور لکھنا فرائض رسالت میں العیاذ باللہ تقصیر اور کوتاہی کا موجب ہوگا جو قطعاً درست نہیں۔

۳۔ آپ نے زبانی تین چیزوں کا ذکر فرمایا، جن میں سے دو تو صراحت سے طور پر مذکور ہیں اور تیسری چیز سلیمان بن احول کو یاد نہ رہی یا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر نہ فرمائی، لیکن وہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کی تاکید ہے جیسے کہ محدثین نے تصریح فرمائی، ان میں بھی خلافت بالفصل یا بلا فصل کا کہیں نام و نشان نہیں جس کے گمان پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مورد طعن و تشنیع بنایا گیا ہے۔ اگر تحریر بھی ان کی فرمانی تھی تو زبانی ان امور

کی وضاحت ہوگئی جس طرح نبوت کے تیئیس سال کا معمول تھا کہ جملہ عقائد و اعمال زبانی ہی بتلائے جاتے رہے۔ اور اگر وہ ان امور کے علاوہ کوئی چیز تھی تو اُمت کی ہدایت کی ضامن اور موجب تحریر کو نظر انداز کرنا صرف چند حاضرین میں سے بعض آدمیوں کے اختلاف کی وجہ سے اور قیامت تک آنے والی امت کی بہتری کو نظر انداز فرمانا رحمۃ للعالمین اور بالمومنین رؤف و رحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان والے نبی سے بعید تر ہے

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خالص ہمدردی اور نیازمندی پر مشتمل مشورہ دیا کہ آپ پر درد کا شدید دورہ ہے اور تمہارے پاس قرآن حکیم ہے جو ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اس میں آپ کی طرف کس طرح بے ادبی اور جرأت و جسارت کی نسبت کی جا سکتی ہے؛ جبکہ آپ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وزرا میں داخل اور مشیروں میں شامل تھے۔ جن کے ساتھ مشورہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور متعدد مقامات پر ان کا مشورہ قبول کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مشورہ کے مطابق وحی نازل فرمائی، لہٰذا مشورہ دینے میں تو کوئی حرج نہیں تھا عمل کے معاملہ میں آپ مالک تھے، مشورہ قبول نہ فرماتے اور اپنے عزم اور حتمی ارادہ کے مطابق عمل فرماتے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ یعنی جب آپ کا پختہ ارادہ بن جائے، تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اور اس کام کو کر لو۔ جب آپ نے وہ تحریر نہ لکھی، تو معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ ہی بدل گیا تھا، ورنہ اس حکم خداوندی کی خلاف ورزی لازم آئے گی اور ترکِ توکل ہوگا قطعاً درست نہیں ہے۔

۵۔ جب اتنا طویل وقت درمیان میں ہونے کے باوجود دوبارہ اس ارادہ کو ظاہر نہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول فرما لیا اور اسی کے مطابق عمل ہوا، لہٰذا یہ چیز آپ کے عظیم مناقب میں داخل ہوگئی کہ آخری لمحے میں بھی آپ کے ہی مشورہ کے مطابق عمل ہوا نہ کہ باعثِ طعن و تشنیع اور موجب جرح و قدح۔

۶- جن لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف اس واقعہ کو بطور حربہ استعمال کیا ہے' ان سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن مجید میں وہ امر تھا یا نہیں تھا جس کی تحریر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ رکھتے تھے۔ اگر نہیں تھا تو دین کامل نہ ہوا اور قرآن مجید کا یہ اعلان اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ نعوذ باللہ غلط ہو کر رہ گیا' کیونکہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تو دین کے اکمال اور نعمت کے اتمام کی خوشخبری سنائی گئی تھی اور ربیع الاول شریف میں یعنی صرف دو ماہ درمیان میں گزرتے پر دین پھر ناقص ہو جاتے اور ہدایت کا دارومدار اور گمراہی سے تحفظ کا ضامن امر ابھی پایا ہی نہ گیا ہو تو اس قدر اہم اور ضروری امر کے اعلان و اظہار کے بغیر دین کامل کیسے ہو گیا اور تکمیل نعمت کیونکر ہو گئی اور اگر اس اہم امر کا بیان قرآن مجید میں تھا تو اب اس کا لکھوانا یا لکھنا تکرار اور تاکید کے زمرہ میں آتا تھا جو بہر حال اس شدید تکلیف کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے ہمدرد اور خیر خواہ کے لئے قابل برداشت نہیں تھا لہذا یہ مشورہ عرض کرنا آپ کا فرض تھا اور آپ نے اپنی طرف سے ہمدردی اور اخلاص کا حق ادا کیا جس پر آپ لائق صد تحسین تھے نہ کہ قابل تنقید و تنقیص کما قال اللہ تعالیٰ : فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ
یعنی قرآن مجید کے علاوہ وہ کس بات سے صاحب ایمان ہو سکتے ہیں ؟

۷- اگر قرآن مجید میں خلافت اور امامت کا مسئلہ حل کیا جا چکا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت بلافصل کی تصریح موجود تھی' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خلافت مرتضوی میں روڑے اٹکانے والا الزام غلط ہو گیا اور آپ کا "حسبنا کتاب اللہ" کہنا خلافت مرتضوی کا انکار نہ ہوا بلکہ اقرار۔ اور اگر اس خلافت و امامت کا قرآن مجید میں ذکر نہیں تھا تو آج وہ آیات شیعہ حضرات کو کہاں سے مل گئیں جو صحابہ کرام کو نہ مل سکیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر اور تشریح کے باوجود مہاجرین و انصار سبھی ان سے بے خبر رہے اور صرف شوریٰ پر ہی دارومدار سمجھ لیا اور اپنا دین و مذہب اور دنیا سب کچھ نعوذ باللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خاطر برباد کر

بیٹھے اور قرآن مجید کو بھی چھوڑ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چھوڑا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی۔ آخر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں وہ کونسی جاذبیت اور مقناطیسی قوت تھی، جس نے سب کو غافل اور بے خبر کر کے رکھ دیا؛ نعوذ باللہ من سوء الفہم و زیغ القلب۔

۸۔ اگر حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسئلہ خلافت کے متعلق ہی اپنا فیصلہ لکھنا چاہتے تھے، تو وہ کس کی خلافت تھی؟ اس پر کیا دلیل ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت کی تحریر کا احتمال تھا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ احتمال موجود تھا۔ تحریر ہو جاتی تو ایک صورت متعین ہو جاتی اور جب تحریر نہیں پائی گئی تو محض احتمال کی بنا پر ان مقدس ہستیوں کو مورد الزام و اتہام ٹھہرانا جن کے فضائل و کمالات اور اخروی نعمتوں اور بلند درجات اور ان سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی وغیرہ کا بیسیوں جگہ قرآن مجید میں اعلان ہے کونسی دینداری اور دیانتداری ہے۔ کیا یہ مسلّم عقلی قاعدہ نہیں ہے: اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، بلکہ اہل السنت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل ترجیح پیش کر سکتے ہیں، کیونکہ جہاں یہ روایت بخاری شریف و مسلم شریف میں ہے۔ دوسری روایت جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق ہے، وہ بھی انہیں میں موجود ہے اور تمام روایات کو سامنے رکھ کر معنی کا تعین ضروری ہوتا ہے نہ کہ صرف اپنی پسندیدہ اور مرضی کی روایت لے کر مخالف فریق کے خلاف جدلی اور الزامی طریقہ اپنا لیا جائے۔ روایت ملاحظہ ہو:

۱۔ عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (الیٰ) ولقد ھممت او اردت ان ارسل الیٰ ابی بکر و ابنہ و اعھد ان یقول القائلون او یتمنی المتمنون ثم قلت یابی اللہ و یدفع المؤمنون او یدفع اللہ و یابی المؤمنون۔ رواہ البخاری باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا، البتہ تحقیق میں نے پختہ ارادہ کیا ہے کہ ابوبکر اور اُن کے بیٹے کی طرف آدمی بھیجوں اور اُن کی طرف عہد کروں تاکہ کہنے والے نہ کہیں یا تمنا و آرزو کرنے والے تمنا و آرزو نہ کریں۔ پھر میں نے کہا، اللہ تعالیٰ انکار کرے گا اور مومن ان کو دُور کردیں گے یا اللہ تعالیٰ دوسروں کو دُور کردے گا اور مومن ان کے ماسوا کی خلافت سے انکار کردیں گے۔

۲۔ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ ادعی لی ابا بکر اباک واخاک حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول قائل انا ولاء ویابی اللہ والمومنون الا ابا بکر رواہ مسلم۔

اس روایت کا بھی معنی ومفہوم وہی ہے جو پہلی روایت کا ہے اور جو ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ روایت مشکوٰۃ باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ میں موجود ہے۔ لہذا بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایات کی تائید سے اس روایت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تحریر کرنے کا احتمال متعین ہوگیا، لہذا صدیقی خلافت کے لیے عہد نامہ لکھنے میں اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رکاوٹ ڈالی بھی ہے تو اس سے شیعہ حضرات کو کونسی شکایت ہوسکتی ہے اور اگر کہا جائے کہ یہ روایتیں موضوع اور من گھڑت ہیں، تو دوسری روایات کی صحت کی کیا ضمانت ہے؟ کیا جس میں اعتراض کی گنجائش نکلے اور صحابہ کرام بالعموم اور شیخین بالخصوص تنقید وتنقیص کا نشانہ بن سکتے ہوں صرف وہی صحیح ہوا کرتی ہے؟ اور جو روایت ابہام واجمال کو دور کردے وہ غلط ہوا کرتی ہے (ما لکم کیف تحکمون)

۹۔ جس علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل کے لیے سب صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، خود ان سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقتِ وصال آچکا ہے، لہذا دریافت کرلو کہ آپ کے بعد امرِ خلافت وامارت کس کے لیے ہے؟ ہمارے لیے ہے یا دوسروں کے لیے؟

تو انہوں نے فرمایا: میں تو دریافت نہیں کرتا اگر آپ نے اس وقت انکار کر دیا تو لوگ کبھی بھی ہمیں خلافت نہیں دیں گے۔ یہ روایت بھی بخاری شریف باب وفات النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہے اور اس پر متعدد حوالے شرح حدیث سے ذکر بھی کیے جا چکے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ کبھی بھی خلافت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ذکر اور اعلان نہ پہلے ہوا اور نہ اس وقت اس پر کوئی علامت کوئی دلیل موجود تھی اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مسئلہ کو چھیڑنا چاہتے تھے۔ جب آپ کا طرزِ عمل یہ ہے تو محض احتمالات کو مدنظر رکھتے ہوئے امتِ مسلمہ کے محسنین اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو موردِ طعن و تشنیع بنانا قطعاً غلط اور ناروا ہے۔

۱۰۔ بعینہٖ یہی مضمون شیعی کتب میں بھی موجود ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کاغذ اور قلم لاؤ، میں تمہیں وہ چیز لکھ دوں، جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو۔ جب انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میرے کاغذ اور قلم لانے تک اگر آپ کا وصال ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ آپ زبانی فرمائیں، میں یاد رکھوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔ نماز کا خاص خیال رکھنا اور مملوک غلاموں اور لونڈیوں کا۔ ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ، جلد ۲، صفحہ ۵۵۵

لہٰذا اس قسم کے توہمات کو بنیاد بنا کر ان مقدس ہستیوں کو نشانہ بنانا مومنین کے لیے قطعاً درست نہیں ہے اور یہ اقدام عقل و خرد اور دین و ایمان کا دشمن ہی کر سکتا ہے۔ ابھی مزید بہت کچھ کہنا باقی ہے، مگر بخوفِ طوالت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

فائدہ: بخاری و مسلم شریف کی ان روایات سے جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے علاوہ کسی کی خلافت پر اللہ تعالیٰ اور مومنین کا راضی نہ ہونا بلکہ اس کو دور کرنا اور دوسری خلافت کا انکار کرنا ثابت ہے اور شیعی تفاسیر میں مندرج روایات جن سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ کا خلیفہ بننا ثابت ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات سے واضح ہو گیا کہ یہ خلافت ظالمانہ اور غاصبانہ نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کے عین مطابق تھی اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ نامزد نہ کر کے اپنی اُمت کو بغیر نگران کے نہ چھوڑا اور نہ انہیں اختلاف و انتشار کے حوالے کیا کیونکہ خود اللہ تعالیٰ اس کا کفیل ہو چکا تھا اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا چکا تھا کہ میرا فیصلہ اور میری قضاء و تقدیر کیا ہے اور میں نے کس شخص کو یہ ذمہ داری سنبھالنے کے لیے منتخب کر رکھا ہے اور یہی قرآن مجید کا مقتضیٰ و مدلول ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم (الایۃ) یعنی اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور صالحین کے ساتھ خلیفہ بنانے کا حتمی وعدہ کر رکھا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس امر کا ضامن اور کفیل ہو چکا تھا، تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اندیشہ اور تفکر کی کیا ضرورت تھی؟

رسالہ تنزیہ الامامیہ — از علامہ ڈھکو صاحب

پیر صاحب سیالوی نے اس روایت کے وجود کا انکار نہیں کیا بلکہ اشارۃً تسلیم کیا ہے کہ شیعہ و سُنّی ہر دو فریق کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہاں بزعم خویش چار ایراد وارد کر کے اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ **پہلے اعتراض کا جواب:** پہلا ایراد کہ مطابق آیہ کریمہ: وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہاتھ سے لکھنا محال ہے اور اس روایت میں ہے کہ میں لکھوں۔ خلاصہ یہ کہ اُمت تو عالم و فاضل ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی اور نبی اُمت اور وہ بھی خواجۂ کائنات اور علتِ غائی ممکنات ان پڑھ محض کہ جس کے لیے لکھنا محال ہے۔ ہزار لعنت بریں عقیدہ باد

۲۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ شیخ الاسلامی کے دعویدار کو لائے نافیہ اور

لائے نہیں اور کسی کام کے نہ کرنے اور نہ کر سکنے میں جو نمایاں فرق ہے وہ بھی معلوم نہیں۔
قول باری تعالیٰ: "وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهُ بِيَمِيْنِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ" سورۂ عنکبوت کا مفہوم یہ ہے کہ اعلانِ نبوت سے قبل پیغمبر علیہ السلام لکھتے پڑھتے نہ تھے، ورنہ باطل پرستوں کو شک کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ یہ جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں، لہٰذا یہ ترجمہ کہ اپنے ہاتھ سے کبھی نہ لکھنا پیر صاحب کا وہ علمی شاہکار ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔

۳۔ اعلانِ نبوت سے قبل نہ لکھنے اور لکھا ہوا نہ پڑھنے میں جو مصلحت ملحوظ تھی وہ اعلانِ نبوت کے بعد ختم ہو گئی، کیونکہ معترضین کو یہ کہہ کر خاموش کیا جا سکتا تھا کہ جس خدا نے نبوت و رسالت عطا فرمائی اُسی نے لکھنا پڑھنا سکھا دیا۔ خاندانِ نبوت سے مروی ہے کہ آپ تہتر زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے اور اتنی ہی زبانوں میں لکھ سکتے تھے اور اسی طرح اہل السنّت کی کتابوں میں بھی آپ کا اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا ثابت ہے (تا) کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کی پوزیشن بچانے کے لیے پیغمبرِ خدا تعالیٰ کی توہین کی پروا نہیں کی جاتی۔

دُوسرے اعتراض کا جواب: ۱۔ بفرضِ تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں، تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی ہے، ورنہ معمولی سی دینی اور سیاسی بصیرت رکھنے والا بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ رحمۃ للعالمین ہی اپنی امت کو ابدی ضلالت سے بچانے کے لیے اپنے آخری لمحاتِ حیات میں وہی چیز تحریر فرمانا چاہتے تھے، جو بذریعہ تقریر اور بعثت سے لے کر دوات قلم طلب فرمانے تک مختلف اوقات میں مختلف اسالیب و عناوین سے برابر بیان کرتے رہے تھے تاکہ اتمامِ حجت کی آخری منزل طے ہو جائے اور وہ سوائے خلافت و امامت مطلقہ حضرت علی کے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

۲۔ علمائے اہل سنت مثلاً علامہ شہاب خفاجی نے نسیم الریاض میں علامہ عسقلانی نے فتح الباری میں، نووی نے شرح المسلم میں اور محدث دہلوی نے شرح

مشکوٰۃ میں بھی کہا ہے، ارادان یبین امر الخلافۃ لئلا یختلفوا۔ ھو تعیین الخلیفۃ بعدہ وغیرہ۔

۳۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اجمال کا پردہ ہی چاک کر دیا ہے لکھتے ہیں، رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی وفات سے قبل فرمایا مجھے کاغذ و دوات لا کر دو تا کہ میں ہر قسم کے اجمال و اشکال کو دُور کر دوں اور بتادوں کہ میرے بعد خلافت کا حق دار کون ہے؟ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو وہ بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ان حقائق کے بعد کوئی شک وشبہ رہ جاتا ہے کہ آپ اپنے حقیقی جانشین کے نام کو ضبطِ تحریر میں لانا چاہتے تھے، لیکن تاڑنے والے تاڑ گئے کہ نام انہیں کا لکھیں گے جن کا نام سینکڑوں بار زبانی بتلا چکے ہیں لہٰذا دیرینہ اُمیدوں پر پانی پھرتا دیکھ کر دماغ رسول پر اعتراض کر دیا۔

تیسرے اعتراض کا جواب، پیر صاحب کے تیسرے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ اِیْتُوْنِیْ جمع مذکر کا صیغہ ہے، لہٰذا بالفرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قلم دوات پیش نہیں کی تھی، تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے تعمیلِ حکم کر کے وہ تحریر کیوں نہ لکھوالی۔ ہم اس کے جواب میں یہی کہیں گے ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

۱۔ یہ مانا کہ روایت میں حکم عام ہے، مگر یہ خطاب انہیں لوگوں کے لیے ہے، جن کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا، لیکن وہ بزرگوار جو ہادی و مہدی ہو اور کائنات کو صراطِ مستقیم پر چلانے والا ہو اسے تحریر لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟ (گویا یہ تحریر حاصل کرنا حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام پر فرض تھا، آپ اس حکم سے مُستثنیٰ تھے!) (محمد اشرف سیالوی)

۲۔ علاوہ بریں جب برادرانِ اسلامی کے بقول شمعِ رسالت کے بڑے پروانے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہذیان کی تہمت لگا دی اور اکثریت نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، تو بعد ازاں حضرتِ امیر یا کوئی دوسرا شخص وہ تحریر لکھوا بھی لیتا، تو

کا وزن کیا ہوتا؟ وہی جو ایک دیوانے کی بڑ کا ہوتا ہے۔

چوتھے اعتراض کا جواب : پیر صاحب کا یہ کہنا کہ فرض کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، مگر جب حضور خود فرماتے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر ہوگا اور اس کے بعد عمر (رضی اللہ عنہما) تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارشاد کے خلاف دوسری خلافت لکھنا چاہتے تھے۔؟

۱۔ پیر صاحب کا یہ کہنا (کلمۃ حق ارید بہا الباطل) کے ضمن میں آتا ہے اور پیر صاحب اس سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں وہ قیامت تک درست ثابت نہیں ہو سکتا۔

۲۔ تفسیر صافی وغیرہ کے جو حوالے ہیں اُن کا صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ وہ خود بخود خلافت اور بادشاہی حاصل کرلیں گے اور یہ خبر اسی طرح کی ہے جس طرح دیگر قیامت تک پیش آنے والے اشراط وعلامات۔ اگر یہ نصوص خلافت تھیں، تو اُمت کے سامنے اس کا اعلان ہونا چاہیے اور اس کو صیغہ راز میں رکھنے کی تاکید نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ یہ ایک پیشگوئی تھی مثل خروج دجال کے جو حرف بحرف پوری ہوئی۔

۳۔ پھر اہل السنت ان خلافتوں کو اجماعی اور شورائی کیوں قرار دیتے ہیں؟ اور نصی کیوں نہیں سمجھتے؟

۴۔ اعلانِ خلافت تو اس قدر ضروری تھا کہ بمطابق ارشادِ خداوندی (وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ) تمام کارِ رسالت کے اکارت ہونے کا اندیشہ تھا، مگر یہاں اس راز کے افشاء پر دل ٹیڑھے ہو رہے ہیں۔ کیا ہے کسی معقول آدمی کے پاس کوئی معقول جواب، ان سوالات کا؟

(رسالہ تنزیہ الامامیہ صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۷)

نوٹ : پیر صاحب نے آیتِ مبارکہ ولا تخطہ کو ہر جگہ ولا تخطوہ لکھا ہے، جس سے اُن کی قرآن دانی پر تیز روشنی پڑتی ہے۔

تحفہ حسینیہ

از ابو الحسنات محمد اشرف سیالوی

علامہ ڈھکو صاحب کے اعتراضات آپ نے ملاحظہ فرمائے اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے جوابات پر تنقید اور جرح و قدح کا آپ نے مطالعہ فرمالیا، لیکن ایک دفعہ پھر رسالہ "مذہب شیعہ" کا متعلقہ مقام پڑھنے کی تکلیف فرمادیں اور آپ کی طرف سے پیش کئے گئے نہج البلاغہ کے اقتباسات پڑھیں جن سے آپ نے یہ ثابت کیا تھا کہ خود امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ میرا اس وقت خلافت کی بیعت لینا قبل از وقت ہے اور کچا پھل توڑنے کے مترادف اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے حکم میں ہے۔ نیز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خلفاء کی اطاعت کا پابند ہوں، لہذا میرے لیے ناممکن ہے کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مخالفت کروں اور پھر خود آپ کا ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا، یہ تمام تر روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تحریر کے منافی بلکہ مناقض ہیں۔ (مذہب شیعہ ص ۷۹، ۸۰)

حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ نے قبل ازیں مفصل روایات، عبارات اور حوالہ جات ذکر فرمائے ہیں، وہاں بھی ڈھکو صاحب نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی اور یہاں پھر اُن کا اجمالی طور پر اعادہ فرما کر حدیث قرطاس کا جواب دیا تو پھر بھی علامہ موصوف نے ان کا جواب نہ دیا جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوا کہ وہ بے بس اور عاجز ہیں اور ان روایات و عبارات کے جواب سے بالکل قاصر، جب اس کے اپنے مذہب کی مستند کتابیں اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات ہی خلافت بلافصل کے دعوی کو سراسر غلط اور بے بنیاد ٹھہراتے ہیں تو ادھر اُدھر بھاگنے اور دُور دُور کی کوڑیاں لانے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

بہر حال ڈھکو صاحب کے ذمے نہج البلاغہ اور بہت سی دوسری کتابوں کے

سوالات کے جوابات باقی ہیں اور اس چوری اور فراڈ کی ناکام کوشش نے ان کی اجتہادی صلاحیت اور حجۃ الاسلامی کو نیست و نابود کر دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ان لاحل کا پوری قوم کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور اب ہم ڈھکو صاحب کے ذکر کردہ جوابات کی حقیقت قارئین پر واضح کرتے ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھنا محال ہے اور اس کا مطلب

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے حدیث قرطاس کے متعلق پہلا قابل غور امر یہ پیش کیا تھا کہ اس میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے لکھنے کا ذکر ہے اور آپ کے لیے بذاتِ خود لکھنا محال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ولا تخطہ بیمینک فرما کر آپ کے نہ لکھنے کی خبر دی ہے اور یہ لائے نافیہ ہے اور یا آپ کو لکھنے سے منع فرمایا ہے اور یہ لائے نہی ہے، لہٰذا ہر دو صورت میں آپ کا لکھنا محال ہے۔ اس تقریر پر شیعی فاضل نے تین طرح سے مواخذہ کی سعی لاحاصل فرمائی ہے، جو آپ ملاحظہ فرما چکے، مگر ان کی ساری کاوش میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ انہوں نے ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے لکھنا محال سمجھ لیا ہے اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کا عقیدہ لازم اور ضروری قرار دے دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ وہ اگر غور کرتے اور تعصب و عناد ان کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج نہ کر دیا ہوتا تو بات بالکل صاف اور واضح تھی کہ اللہ تعالیٰ کی خبر کے خلاف کرنا یا اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ممکن نہیں تھا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھنے کو محال بالذات نہیں کہا گیا بلکہ محال بالغیر کہا گیا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نہ لکھنے کی خبر کے لحاظ سے اور آپ کی شانِ اطاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے۔

مثلاً تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ معصوم ہیں اور ان سے کفر و کبائر کا سرزد ہونا محال ہے لیکن علامہ ڈھکو صاحب جیسا محقق اس عبارت کو دیکھ کر کہہ دے

واہ رے سنی علماء۔ اُمتی تو ایسے کام کریں اور جن و شیاطین بھی کر سکیں، مگر اُولوالعزم مقتدر رُسل کرام نہ کر سکیں اور عظیم قوتوں اور قدرتوں کے مالک ملائکہ نہ کر سکیں یہ کیسے ممکن ہے؟ لیکن آپ کا یہ دعویٰ سراسر تحکم اور سینہ زوری ہوگا، بلکہ حماقت؛ کیونکہ انہوں نے اس قول میں انبیاء و رُسل اور ملائکہ کرام کی شانِ عصمت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بالکل اور بعینہٖ اسی طرح لکھنے کے معاملہ میں بھی ڈھکو صاحب نے سینہ زوری سے کام لیا ہے بطریقِ اعجاز اور خرقِ عادت لکھ سکنے کی نفی نہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمائی نہ ہی وہ محلِ بحث ہے، بلکہ کلام عملی طور پر لکھنے میں ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ لکھنے کی خبر یا لکھنے سے نہی کے پیشِ نظر اور محال بالعرض اور ممتنع بالغیر کے طریقہ پر اور اگر آپ کا یہ مقصد نہ ہوتا تو لا سے نفی یا لا نے نہی کو ذکر ہی کیوں فرماتے آپ کا قول باری تعالیٰ وَلَا تَخُطُّهٗ میں لا سے نفی اور لا نے نہی کو ذکر فرما کر نبی الانبیاء محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کو محال قرار دینا اسی حقیقت کا واضح بیان ہے مگر اہلِ ابصار و بصائر کے لیے۔

شق ۲۔ دوسری شق میں ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ شیخ الاسلام کے دعوے وار کو نہ کرنے اور نہ کر سکنے کا فرق معلوم نہیں۔ نیز لا سے نفی اور لا نے نہی کا فرق بھی معلوم نہیں اور وَلَا تَخُطُّهٗ جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں ہے الخ قبل ازیں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا مطلب انہیں کی عبارت کے سیاق و سباق کی رُو سے عرض کیا جا چکا ہے اور نہ کر سکنے کی حقیقت واضح ہو چکی ہے، مگر بدقسمتی سے علامہ صاحب نے خود عبارت سمجھی ہی نہیں تھی۔ نیز لا سے نفی اور لا نے نہی میں فرق نہ سمجھتے تو دونوں کا لطور تقابل ذکر ہی کیوں فرماتے اور لا نے نہی ہونے کی صورت میں ترجمہ بالکل وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر فرمایا۔ ہاں البتہ اس پر اعتراض کرنا جہالت کا ایسا شاہکار ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا، بلکہ نفی کی صورت میں بھی معنی نہی والا ہی ہوگا اور اس کو صورتِ خبر میں ذکر کرنا مزید تاکیدِ حکم اور مبالغہ کے لیے ہوگا جیسے کہ کتبِ معانی و بیان میں اس کی تفصیل موجود ہے اور یہ دعویٰ کہ وَلَا تَخُطُّهٗ فقط جملہ

خبریہ ہے اور اس میں انشائیت کا احتمال بھی نہیں ہے محض دعویٰ ہی ہے جو محلِ نزاع میں غیر مسموع ہے۔

شق ۳: تیسری شق میں ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ جو مصلحت اعلانِ نبوت سے قبل نہ لکھنے اور لکھا ہوا نہ پڑھنے میں تھی وہ اعلانِ نبوت کے بعد ختم ہو گئی۔ تو ہم ڈھکو صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ اعلانِ نبوت کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات و انجیل، زبور اور دیگر صحفِ سماویہ کا مطالعہ شروع فرما دیا تھا؟ یا قرآنِ مجید اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور کسی کاتب کو کتابتِ وحی کی تکلیف نہیں دیا کرتے تھے؟ جب آپ نے کتبِ سابقہ کا مطالعہ بھی کبھی نہ فرمایا اور قرآن مجید کی کوئی آیت بھی اپنے ہاتھ مبارک سے نہ لکھی اور اعلانِ نبوت کے بعد کتابوں کے مطالعہ اور قرآنِ کریم کی کتابت والا معجزہ ظاہر کر کے اپنی حقانیت و صداقت نبوت پر اس کو دلیل نہ بنایا تو ثابت ہو گیا کہ یہ قولِ مبارک صرف قبل از اعلانِ نبوت کی حالت کو نہیں بتلا رہا اور نہ مصلحتِ سابقہ پر دلالت کر رہا ہے، بلکہ آئندہ کے لیے بھی وہی حکم تھا اور اسی پر آپ نے زندگی بھر عمل فرمایا اور اس مصلحت کو اعلانِ نبوت کے بعد بھی ملحوظ رکھا۔ لہٰذا علامہ موصوف کا یہ دعویٰ کہ اعلانِ نبوت کے فوراً بعد وہ مصلحت ختم ہو گئی، سراسر لغو اور بیہودہ ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وصفِ اُمیت کی بقا اعلانِ نبوت کے بعد بھی بہت ضروری تھی جو شخص اہلِ کتاب وغیرہ سے مشرف باسلام ہونے کے لیے آتا، جن کو معلوم تھا کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اُمی ہوں گے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: الذین یتبعون النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل۔ اور وہ آپ کو کتابت کرتے دیکھتا یا کتبِ سماویہ کا مطالعہ کرتے دیکھتا تو وہ کس طرح اُمی والی علامت آپ میں موجود ہونے کا یقین کرتا اور کتبِ سابقہ کی اقتداء و اتباع میں آپ پر کس طرح ایمان لاتا؟ لہٰذا آخر تک آپ کا وصفِ امیت پر رہنا ہی سراسر مصلحت اور عین حکمت تھا۔ گو شیعی علماء اس کو سمجھنے سے قاصر ہی ہوں۔

کیا سیدِ عالم و عالمیان صرف تہتّر زبانیں جانتے تھے؟

علامہ ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تہتر زبانیں جانتے تھے اور ان میں کلام فرما سکتے تھے، لیکن ہم کہتے ہیں صرف تہتر کیا تہتر ہزار زبانیں جاننا بھی بعید نہیں، کیونکہ آپ تمام جہانوں کے لیے رحمتِ مجسّم بنا کر بھیجے گئے، لہٰذا جتنی اجناس واصناف اور انواع واقسام امم واقوام کی ہیں، حیوانات ہوں یا جن وانسان ان سب کی بولیاں آپ کو معلوم تھیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ۔ یعنی ہم نے ہر نبی ورسول کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ انہیں اپنا مدعا ومقصود سمجھا سکے اور ان کی بات بھی سمجھ سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب انسانوں، جنوں اور ملائکہ نیز جملہ حیوانات کے لیے بھی رسولِ رحمت ہیں کما قال اللہ تعالیٰ: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ لہٰذا ان تمام کی زبانیں آپ کو معلوم ہونی چاہئیں لیکن باوجود اس قدر علم کے محلِ بحث امیت اسی طرح برقرار اور باقی ودائم رہے گی، کیونکہ یہ زبانیں عام طریقہ تعلیم کے مطابق آپ نے حاصل نہیں کیں۔ اگر عربی النسل بچہ فصیح عربی بول لے لیکن بطور تعلیم تعلّم نہ ہو اور ہم اس معیار کی عربی نہ بول سکیں، مگر درسی تعلیم حاصل کی ہو تو بچہ بھی ودائمی رہے گا اور ہم اُمّی نہیں ہوں گے۔ نیز یہ وسعتِ علمِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کسی غلط فہمی کی موجب نہیں ہو سکتی، بلکہ حقانیت کی دلیل ہوگی اور اگر لکھنا شروع فرما دیں اور مطالعہ شروع فرما لیں تو مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نیز تہتر زبانوں میں آپ کا لکھ سکنا بطورِ معجزہ محلِ بحث نہیں ہے، لیکن بطورِ عادت جاریہ ایک سطر لکھنا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا اور کلام اسی کے حوالے سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ لکھنے کی پابندی ہیں اور علامہ موصوف کی توجہ کے لیے عرض کردوں کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ اگر بطور اعجاز بھی لکھنا آپ کے حق میں محال سمجھتے تو ولا تخطہ کے اندر لاتے نہی کا احتمال ہی ذکر نہ فرماتے اور نہی والا معنی ہی نہ کرتے۔

بھی صرف لکیر کھینچنے تک محدود ہے۔ لہٰذا اس سے علامہ صاحب محلِ نزاع میں کیا حاصل کرسکتے ہیں ماسوا غوغا آرائی کے۔ کیونکہ سبب آمر کی طرف فعل کا نسبت کیا جانا متعارف اور عام ہے۔ الغرض ڈھکو صاحب کی ساری تحریر اور گرج اور چمک صرف اپنی غلط فہمی بلکہ کج فہمی پر مبنی ہے جس کی ذمہ داری حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

شیعی علماءِ اعلام کے اقوال

آئیے اب اس مسئلہ پر شیعی علماءِ اعلام کے اقوال ملاحظہ کریں۔

صاحب ناسخ التواریخ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیازی اور مختص احکام میں سے حرام امور کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے۔ درذکر محظورات ومحرمات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (تا) پنجم خط نوشتن قال اللہ تعالیٰ، ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون۔ (جلد اول از کتاب دوم ص۵۹۹)

آپ کے لیے مختص امور اور احکام میں سے پانچواں حرام اور ممنوع امر ہے خط لکھنا اور تحریر کرنا جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اور نہ لکھنا تم اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے ورنہ باطل پرست لوگ شک وتردد میں پڑیں گے۔ کہیے علامہ صاحب جملہ خبریہ اور لا کے نافیہ کی صورت میں خط لکھنا حرام کیسے ہو گیا؟ لفظاً یا معنیً جملہ انشائیہ ماننا لازم ہے یا نہیں؟ اور جو معنی حضرت شیخ الاسلام نے کیا وہی آپ کے علماء سے ثابت ہے یا نہیں؟ کیا یہ ترجمہ حضرت پیر صاحب کا فی الواقع علمی شاہکار ہے یا نہیں ہے؟

۲۔ علامہ طبرسی نے سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے حوالے سے لکھا ہے:

ھذہ الآیۃ تدل علی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما کان یحسن ان یکتب قبل النبوۃ فاما بعد النبوۃ فالذی نعتقدہ فی ذالک التجویز لکونہ عالما بالقرأۃ والکتابۃ والتجویز لکونہ غیر عالم بھما من غیر قطع علی احد الامرین

وظاهر الاية يقتضى ان النفى قد تعلق بما قبل النبوة دون ما بعدها ولان التعليل يقتضى اختصاص النفى بما قبل النبوة لان المبطلين انما يرتابون فى نبوته لو كان يحسن الكتابة قبل النبوة فاما بعد النبوة فلا تعلق له بالريبة والتهمة فيجوز ان يكون تعلمها من جبرئيل عليه السلام (تفسير مجمع البيان ج ۷ ص ۲۸۶، ۲۸۸ و منہج الصادقین ج ۷ ص ۱۲۸، ۱۲۹)

یہ آیتِ کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ نبوت سے پہلے درست طریقہ پر نہیں لکھ سکتے تھے۔ رہا اعلانِ نبوت کے بعد کا دور تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ممکن ہے آپ اس میں کتابت اور قرأت کا علم اور ملکہ رکھتے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دوران بھی آپ کو یہ ملکہ حاصل نہ ہو کسی ایک امر کا حتمی علم اور یقین نہیں ہے۔ ہاں آیتِ کریمہ سے بظاہر یہی پتہ چلتا ہے کہ نفی کا تعلق اعلانِ نبوت سے پہلی حالت کے ساتھ تھا نہ کہ اعلانِ نبوت کے بعد والے دور سے۔ نیز جو علت اس نفی کی بیان کی گئی ہے، وہ بھی اعلانِ نبوت سے پہلی حالت کے ساتھ نفیِ کتابت کا اختصاص چاہتی ہے کیونکہ باطل پرست اسی صورت میں آپ کی نبوت میں شک و شبہ کر سکتے تھے، جبکہ آپ قبل از نبوت اچھی طرح لکھ سکتے ہوتے، لیکن اعلانِ نبوت کے بعد والے دور کو اس تہمت اور ریبت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے کتابت کا علم اور ملکہ حاصل کر لیا ہو۔

شیعہ کا مذہب مختار

مجمع البیان اور منہج الصادقین کی عبارات ہی ڈھکو صاحب کی تعلی اور گرج چمک کی بنیاد تھیں اور یہ حوالہ یہی تقریباً انہوں نے اپنے رسالہ میں درج کر دی لیکن ان عبارات سے صرف اتنا قدر ثابت ہوا کہ ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

جبرئیل علیہ السلام سے فن کتابت کا علم حاصل کر لیا ہو، لیکن اس کا یقین اور اعتقاد لازم نہیں ہے لیکن آئیے دیکھیں کہ ان کا مذہب مختار اس باب میں کیا ہے؟ علامہ فتح اللہ کاشانی کے قول کے مطابق جو لوگ آپ کو آخر عمر تک امی تسلیم کرتے ہیں، وہی صواب کے بہت قریب ہے اور شعرانی نے کہا۔ صحیح بھی یہی ہے۔

۱۔ "مذہب آنانکہ وے صلی اللہ علیہ وسلم را اُمّی دانند از اول عمر تا آخر عمر بصواب اقرب است۔" منہج الصادقین ج ۷ صـ ۱۶۹

یعنی جن لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول عمر سے آخر عمر تک اُمّی تھے، وہ صواب اور درستگی کے بہت زیادہ قریب ہے۔

۲۔ صاحب تفسیر نے کہا تھا کہ آغاز کار میں رسم الخط اور لکھا ہوا پڑھنے کا علم و ملکہ نہ ہونا فضیلت تھا: "وچوں معجزہ ظاہر شد و در اُمیّتِ اُو شک و شبہ نماند حق تعالیٰ در آخر عمر ایں فضیلت بوے ارزانی داشت تا معجزہ دیگر باشد۔"

یعنی جب آپ کا معجزہ ظاہر ہو گیا اور آپ کے اُمّی ہونے میں شک و شبہ نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آخری عمر میں یہ فضیلت عطا فرما دی۔

لیکن ابوالحسن شعرانی صاحب نے اپنے حاشیہ میں اس پر رد کرتے ہوئے لکھا کہ ان لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کے لیے علم قرأت اور علم الخط اندازے، حدس اور گمان سے ثابت کیا ہے نہ کہ نقل اور روایت کے ساتھ۔ "و تاریخ را باید بنقل ثابت کرد نہ بحدس" اور لکھنے وغیرہ کے قول کو نقل کے ساتھ ثابت کرنا چاہیے نہ کہ ظن و تخمین کے ساتھ اور جن لوگوں نے یہ قول کیا ہے ان کا منشأ قول یہ ہے کہ لکھنا اور پڑھنا فضیلت ہے اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اس فضیلت سے خالی نہیں ہونی چاہیے۔

"ولیکن حق آنست کہ خط و کتابت و قرأت برائے تعلیم و تعلم است و خود فی حد ذاتہٖ فضیلت نیست و آنکہ بے واسطہ با عالم اعلیٰ رابطہ دارد چہ نیاز ش بخط و قرأت باشد۔" حاشیہ منہج الصادقین، ج ۷ صـ ۱۶۹

لیکن حق و حقیقت یہ ہے کہ علم الخط اور علم قرأت اور لکھا ہوا دیکھ کر پڑھ سکنا تعلیم و تعلم کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہے، بذاتِ خود کوئی فضیلت نہیں ہے، لہٰذا وہ ہستیٔ مقدس جو بلا واسطہ عالمِ بالا اور ربِ اعلیٰ کے ساتھ رابطہ رکھتے ہوں، اُن کو رسم الخط اور لکھا ہوا پڑھ سکنے کی طرف محتاج نہیں ہو سکتی۔

ستر علوم پر دسترس اور اُن میں لکھنے کی حقیقت

علامہ ڈھکو صاحب نے اپنا عقیدہ و نظریہ بیان کیا تھا کہ آپ کو ستر علوم پر کامل دسترس تھی اور ان میں آپ لکھ پڑھ سکتے تھے، لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ دراصل وہ روایت بصائر الدرجات کی ہے جو خود بھی ضعیف کتاب ہے اور اُس کی یہ روایت بھی ضعیف ہے جیسا کہ حاشیۂ منہج الصادقین" میں ہے۔

"در بصائر الدرجات کہ خود کتابے ضعیف است بسند ضعیف روایت کردہ است کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہفتاد زبان میخواند و می نوشت و ایں با مخالف بظاہر قرآن است۔ خواندن باعجاز و وحی و تعلیم جبریل در ہر جا کہ ثابت شود از محل کلام خارج است۔ منہج الصادقین جلد ۷، ص ۱۶۹

یعنی "بصائر الدرجات" میں جو کہ بذاتِ خود کتاب بھی ضعیف ہے، پھر اس میں ضعیف روایت کے ساتھ مروی و منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ستر زبانوں میں پڑھتے اور لکھتے تھے، لیکن یہ روایت قرآن مجید کے ظاہری معنی و مفہوم کے خلاف ہے۔ بطورِ اعجاز پڑھ لینا یا وحی اور تعلیم جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ جہاں بھی ثابت ہو وہ محلِ بحث اور مقامِ نزاع سے خارج ہے۔

یہ تھی علامہ ڈھکو صاحب کی دلیل و برہان جس کو خود اس کے اہلِ مذہب نے رد کر دیا تھا اور بناء الفاسد علی الضعیف فی الضعیف قرار دیا تھا۔

اقول، علاوہ ازیں اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمر شریف کے آخری حصہ میں فنِ کتابت اور قرأت میں مہارت حاصل کر چکے تھے، تو اب آپ کو اُمّی والے

لقب سے موصوف کرنا غلط ہونا چاہیے کیونکہ جو پہلے اُمّی ہو اور بعد ازاں لکھ پڑھ لے اور علوم مروجہ کی تکمیل کرلے، تو اس کو اُمّی نہیں کہہ سکتے، لہٰذا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر شریف کے آخری حصہ میں اُمّی کہنا غلط ہونا چاہیے اور اگر یہ وصف ذکر کیا جائے، تو توہین و تحقیر کا ارتکاب لازم آنا چاہیے، کیونکہ پڑھے لکھے کو اُمّی کہنا اس کی تعلیم و تعلّم اور اس فن میں دسترس کا انکار ہے، حالانکہ یہ لازم باطل ہے، لہٰذا ملزوم بھی باطل ہے اور علامہ فتح اللہ کاشانی کا یہ قول برحق ثابت ہوگیا کہ جو لوگ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّل عمر سے لے کر آخر عمر تک اُمّی تسلیم کرتے ہیں، صواب اور صحیح ترین قول انہیں کا ہے۔ ڈھکو صاحب اب کہیے! لعنت بریں مذہب باد! تاکہ تمہارے ہی منہ پر لوٹ کر آئے، کیونکہ تمہارا اپنا مذہب مختار یہی ہے۔

الحاصل جب آپ اُمّی ہیں اور آپ پر لکھنا حرام ہے، تو قول باری تعالیٰ، وَلَا تَخُطُّہٗ خبر ہو تو معنیٰ نہی والا ہی ہے، تو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا ترجمہ بالکل عین صواب اور حقیقت کے مطابق ہوگیا، لہٰذا اس پر ڈھکو صاحب کی تنقید اپنی جہالت اور اپنے مذہب سے بیگانگی کا نتیجہ ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص احکام سے لاعلمی کا ثمرہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّی ہونے کا مطلب

یہ امر ذہن نشین رہے کہ ہمارے نزدیک اُمّی ہونے کا آپ کے حق میں یہ مطلب نہیں کہ آپ بے علم تھے نعوذ باللہ بلکہ آپ کے اُمّی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرنے والے اور تعلیم و تربیت میں مخلوق کا بارِ احسان نہ اٹھانے والے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے سب کچھ سیکھنے اور حاصل کرنے والے اور تعلیم و تربیت پانے والے کما قال اللہ تعالیٰ، وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم (الآیہ) نیز فرمایا، ثم ان علینا بیانہ اور فرمایا سنقرئک فلا تنسیٰ (الآیہ) اسی لیے امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے

فرماتے ہیں ؎ کفاک بالعلم فی الامی معجزۃ
فی الجاھلیۃ والتادیب فی الیتم

یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ جاہلیت میں موجود ہونے اور اُمّی ہونے کے باوجود صاحب علم ہونا اور یتیمی کے باوجود حسنِ ادب اور اخلاقِ عالیہ سے متصف ہونا صداقتِ نبوت پر معجزانہ دلیل ہے اور اسی حقیقت کو امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے یوں ادا فرمایا ہے ؎

ایسا اُمّی کس لیے منت کشِ اُستاد ہو
کیا کفایت اُس کو اقرأ ربک الاکرم نہیں

بلکہ یہ وہ اُمّی ہیں جن پر سلسلہ تعلیم کی انتہا ہوگئی اور پھر کسی معلم کائنات اور نبی و رسول کے مبعوث فرمانے کی ضرورت نہ رہی اور پہلی شریعتیں ان کی شریعت سے منسوخ ہوگئیں اور پہلی کتابیں ان کی کتاب سے۔ ولنعم ما قیل! ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست   کتب خانۂ چند ملت بشست

حدیث قرطاس کی دُوسری توجیہ اور جناب علامہ ڈھکو صاحب کی جواب میں فریب کاری!

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے الفاظ پہلے ملاحظہ فرمالیں۔ آپ فرماتے ہیں بفرض تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور وہ بھی بلافصل اس سے کیسے ثابت ہوگئی۔ ص۱۷۹ اس کے جوابات میں ڈھکو صاحب نے جو مبسوط تحریر سپرد قرطاس فرمائی، بتلاؤ اسے کوئی مناسبت حضرت شیخ الاسلام کے فرمان سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں اس روایت میں قطعاً خلافت کا ذکر ہی نہیں چہ جائیکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور وہ بھی بلافصل مذکور ہو۔ ڈھکو صاحب نے کس جملہ سے اس جواب کو توڑا ہے۔ کتب اہل السنت کا حوالہ دیا ہے تو ان میں بھی بطور احتمال اس امر کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی خلافت بلافصل حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تو مراد

نہیں، مگر اس سے روایت میں تصریح خلافت کیسے ثابت ہو گئی اور عقلی طور پر جو جواب دیا ہے کہ زندگی بھر مختلف اسالیب و عناوین سے جس کا ذکر کیا تھا اب وہی لکھنی تھی اور کیا لکھنا تھا؟ یہ جواب بھی غلط ہے کیونکہ از روئے عقل کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس کو زندگی بھر بیان فرماتے رہے اور اس کا اعلان کرتے رہے، اس کا ذکر اب تکرار محض کی وجہ سے اتنا اہم نہیں تھا، جتنا قدر کہ دوسرے اہم دینی امور لہٰذا جو ابھی بتکرار بیان نہیں ہو سکے تھے۔ ان کے لیے لکھنے کا اہتمام مقصود تھا تو اس عقلی وجہ کو کیوں نظر انداز کیا جائے اور جو ڈھکو صاحب کے عقل نے اختراع کی ہے اس کا کیوں التزام کیا جائے، لہٰذا نہ از روئے نقل یہ جواب صحیح ہوا اور نہ ہی از روئے عقل۔

امام غزالی علیہ الرحمہ پر بہتان

علامہ صاحب نے حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کی طرف ایک عبارت کی نسبت کر دی لیکن ان کی کسی کتاب کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ کیا اس طرح کے دعوے اور دلائل کی مثال و نظیر کسی نے دیکھی ہے؟ غالباً آپ سر العالمین کا حوالہ دینا چاہتے تھے، لیکن طبعی تقاضا کے برعکس شرم آگئی کہ اپنی لکھی ہوئی کتاب کی نسبت اہل السنت کے عالم کی طرف کر کے جگ ہنسائی اور رسوائی کیوں مول لیں، لیکن پوری طرح شرم نہیں آئی، ورنہ یہ موضوع اور من گھڑت عبارت ذکر ہی نہ کرتے نہیں نہیں بلکہ بہت بڑی فریب کاری کا مظاہرہ کیا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ "احیاء العلوم" جیسی معروف زمانہ کتابوں میں مذکور عبارت کا حوالہ ہے، حاشا وکلا، یہ ان کی کسی معروف کتاب میں نہیں، بلکہ ان سب میں اس کے منافی و مخالف عقیدہ کا اثبات ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے اس کتاب کے اور امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ملاحظہ ہو۔

مجمل عقیدہ او ایں است کہ در مبادی حال بواسطہ مصاحبت رؤسا

اہلِ ضلال از نورِ ایمان خالی بودہ و آخر مومن موالی بلکہ شیعہ اعالی گردیدہ ـــ
(مجالس المومنین صد ۱۹۲)

یعنی اجمالی طور پر غزالی علیہ الرحمہ کے عقیدے کا بیان یہ ہے کہ ابتدا میں وہ اہلِ ضلال کی صحبت کی وجہ سے نورِ ایمان سے خالی تھے اور آخر میں مومن موالی ہو گئے اور عالی مرتبت شیعہ۔

در کتاب سرّ العالمین کہ آں را سرِّ مکنون نیز گویند و آں از جملہ کتبے است کہ غزالی آں را در آخر نوشتہ و افشار سرِ خود نمودہ و تصریح بارتدادِ خلفاء ثلاثہ و تابعان ایشاں فرمودہ۔ یعنی کتاب سرّ العالمین جس کو سرِ مکنون بھی کہا جاتا ہے اور یہ منجملہ ان کتابوں کے ہے جن کو امام غزالی علیہ الرحمہ نے عمر کے آخری حصہ میں لکھا اور اپنے راز کا افشار کیا اور خلفاء ثلاثہ اور ان کے متبعین کے مرتد ہونے اور دینِ حق سے برگشتہ ہونے کا قول کیا۔
(مجالس المومنین جلد دوم، صد ۱۹۶)

جب قاضی شوستری یہ راز بیان کر چکا، تو ایک سوال سوجھا، لہذا اس کا جواب دینا بھی ضروری سمجھتے ہوئے سوال و جواب کو کتاب میں درج کیا، آپ بھی ذرا اس سوال و جواب کا مطالعہ فرما کر محظوظ ہوں اور علامہ ڈھکو صاحب کی ڈھٹائی میں اس کی مجبوری و معذوری کو محسوس کریں، کیونکہ اخلاف اپنے اسلاف کی راہ کیونکر چھوڑ سکتے ہیں اور تلبیس و تدلیس کا یہ طریقہ انہیں اسلاف سے ہی ورثہ میں ملا ہے، لہذا وہ اس معاملہ میں مجبور محض ہیں۔

سوال ، کسے نگوید کہ چوں حکم بتشیع غزالی و امثال او کہ بمذہب اہل السنت اشتہار دارند نمودید پس باید کہ سخن ایشاں را کہ در کتب کلامیہ و غیر آں مسطور است براہل سنت حجت نسازید۔ جواب ، زیراکہ ما میگوئیم کہ حکم ما بتشیع غزالی و امثال او نظر بباطن حال ایشاں و شکے نیست کہ ظاہر حال ایشاں موافق اہل السنت بودہ و تصانیف ایشاں برطبق عقائد آں جماعت واقع شدہ۔ و ہمگی مطالعہ آں تصانیف کردہ اند و آنچہ در آنجا مسطور است بقبول تلقی نمودہ اند و آں را مخالف روایات و

درایات خود ندانستہ اند پس فی الحقیقت احتجاج ما باچہ در تصانیف امثال غزالی است احتجاج است بتصانیفیکہ اہل السنت آں را اعتبار کردہ اند بلکہ افتخار بآں نمودہ اند ہرچند مصنف آں شیعی باشد باطناً یا ظاہراً۔ (مجالس جلد دوم صفحہ ۱۹۸)

سوال یعنی کوئی شخص یہ نہ کہے کہ جب تم غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کے شیعہ ہونے کے قائل ہو تو پھر اُن کی وہ عبارات جو کتب کلامیہ وغیرہ میں مسطور ہیں اور مسلکِ اہل سنت کے خلاف ہیں، وہ اُن کے خلاف بطورِ حجت دستہ پیش نہ کرو (کیونکہ یہ تو شیعہ کی عبارت کو اہل سنت کے خلاف حجت قرار دینے کے مترادف ہوا)

جواب کیونکہ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارا غزالی اور اس قسم کے لوگوں کو اہل تشیع میں شمار کرنا ان کے باطنی حال کے پیش نظر ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ ان کا ظاہری حال اہل سنت کے موافق ہے اور اُن کی تصانیف بھی اہل سنت کے مطابق پائی گئی ہیں اور تمام اہل السنت نے ان کا مطالعہ کیا اور اُن کو اپنے ہاں قابلِ قبول ٹھہرایا اور اُن کو اپنی روایات و درایات کے مخالف نہیں سمجھا، لہٰذا درحقیقت ہمارے استدلال کا دارومدار ان تصانیف پر ہے جن کو اہل السنت نے معتبر سمجھا ہے، بلکہ ان پر فخر کا اظہار کیا ہے، خواہ اُن کا مصنف باطن میں شیعہ ہو یا ظاہر میں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اہل السنت امام غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کی جن کتابوں پر اعتبار و اعتقاد کرتے ہیں اور اُن پر اظہارِ فخر کرتے ہیں، اُن میں ایسی عبارات نہیں ہیں جو شوستری صاحب نے نقل کی ہیں اور جن میں ایسی عبارات ہیں وہ سربستہ راز ہیں، جن سے صرف شیعہ حضرات آگاہ ہوتے اور وہ اہل السنت کے نزدیک نہ قابلِ قبول اور نہ امام غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کی تصنیفات ہی ہیں، لہٰذا جو معتبر اور مقبول ہیں، ان میں عقیدہ اہل السنت کی صحیح اور مکمل ترجمانی ہے، ان کو اہل السنت کے خلاف کوئی احمق پیش کر سکتا ہے، اور جن کو پیش کیا جاتا ہے وہ اہل سنت کے نزدیک صحیح النسبت ہی نہیں، لہٰذا ان کو اہل سنت

کے "ناف پیش کرنا بھی سراسر تحکم اور سینہ زوری ہے۔ الغرض اس سوال کا دوبارہ سہ بارہ مطالعہ کرو اور جواب کی مطابقت بھی مشاہدہ کرو تو یقیناً یہی کہنا پڑے گا

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی (غالب)

جب امام غزالی علیہ الرحمہ بقول قاضی شوستری شیعہ ہو گئے تھے اور تشیع کے بعد انہوں نے کوئی کتاب لکھی جس میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق نعوذ باللہ مرتد ہونے کا قول کیا وغیرہ وغیرہ، تو ایسی کتاب نصیر الدین طوسی کی ہو یا امام غزالی کی اس سے اہل سنت کو الزام دینے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

کتاب سر العالمین حضرت شاہ عبدالعزیز کی نظر میں

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۳۲ پر شیعہ کے اکیسویں مکر و کید کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کبھی اپنے طور پر کتاب لکھ کر اس میں صحابہ کرام علیہم الرضوان پر طعن و تشنیع اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی عبارات درج کر کے اہل سنت والجماعت کے اکابر علماء میں سے کسی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس کتاب کے آغاز میں خطبہ لکھ دیتے ہیں، جس میں کتمان اسرار اور حفظ امانت کی وصیت درج کر دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے، وہ ہمارا خفیہ عقیدہ ہے اور جو کچھ دوسری کتابوں میں لکھا ہے، وہ محض پردہ داری اور زمانہ سازی کے طور پر لکھا ہے۔

مثل کتاب سر العالمین کہ آں را بامام غزالی نسبت کنند و علیٰ ہذا القیاس کتب بسیار تصنیف کردہ اند و بہر یک از معتبرین اہل السنت نسبت نمودہ اند و کسی کہ بکلام آں بزرگ آشنا باشد و مذاق سخن غیر او امتیاز و تفرقہ نماید کمیاب می باشد ناچار عوام طلبہ دریں مکر غوطہ خورند و حیلے سراسیمہ و حیران شوند۔ (تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۳۲)

مثل کتاب "سر العالمین" کے جس کو امام غزالی کی طرف نسبت کرتے ہیں اور علیٰ ہذا القیاس بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور اہل السنت کے معتبر علماء کرام میں

سے ہر ایک کی طرف ایسی اختراعی کتابوں کی نسبت کی ہے اور چونکہ ہر شخص اس بزرگ کے کلام سے آشنا نہیں ہوتا اور اس کے مذاق سخن کو دوسرے لوگوں کے مذاق سخن سے جُدا اور ممتاز نہیں کر سکتا، لہذا ناچار، عام طلبہ اس مکر میں غوطے لگانے لگ جاتے ہیں اور بہت زیادہ حیران و سرگردان ہوتے ہیں۔

اقول، یہ طریقہ واردات صرف علما اکابر کے ساتھ نہیں بلکہ ائمہ کرام کے ساتھ بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ جو کچھ وہ مجمع عام میں اور خطبات میں فرماتے اس کو زمانہ سازی اور پردہ داری اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا بہانہ قرار دیتے ہیں اور اپنی طرف سے روایات گھڑ کر ائمہ کی طرف منسوب کر کے اسے ان کا اصلی اور باطنی عقیدہ قرار دیتے ہیں اور اسی غرض سے مستقل چور دروازہ تقیہ والا ایجاد کیا ہے۔ اللّٰھم انا نجعلك فی نحورھم و نعوذ بك من شرورھم۔

امام غزالی سید نعمت اللہ الموسوی الجزائری کی نظر میں

اگر علامہ ڈھکو صاحب نے اپنے علماء مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو پھر کبھی ایسی جرأت نہ کرتے اور "سر العالمین" جیسی کتاب سے استدلال نہ کرتے۔ شیعی فاضل سید نعمت اللہ الجزائری نے صوفیاء کرام پر جرح و قدح کرتے ہوئے حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق اپنے غیظ و غضب اور بغض و عناد کا خوب اظہار کیا اور ان کی تالیفات معروفہ کے حوالہ جات سے شیعہ کے خلاف اُن کے تاثرات کو مفصل طریقہ پر بیان کیا؛ چنانچہ جزائری صاحب نے کہا:

۱۔ احیاء العلوم میں امام غزالی نے لکھا ہے، قد انکشف لہ فضل ابی بکر علی امیر المومنین علی علیہ السلام کہ ان کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا کشف ہوا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حقیقت اُن پر منکشف کی گئی۔

۲۔ اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" جو کہ انہوں نے درس و تدریس کے ترک

کرنے اور مجاہدات و ریاضات میں بیس سال تک مشغول رہنے کے بعد تالیف کی اس میں انہوں نے شیعہ کا رد کیا اور ان کے عقیدہ عصمتِ ائمہ کو باطل قرار دیا اور اس میں مذہبِ امامیہ کے بطلان کا کشف ہونے کی تصریح کی ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

وانکشف له بطلان مذهب الامامیه بعد ان ترك التدریس وانقطع فی دمشق ومکة المکرمة نحوًا عن عشرین سنة ملازمًا للخلوة فی آخر عمره وصنف کتابًا سماه المنقذ من الضلال یتضمن الرد علی من یدعی العصمة والابطال لمذهبهم۔

۳۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے بار بار احیاء العلوم وغیرہ میں روافض کا ذکر آنے پر لکھا، قالت الرافضة خذلهم الله تعالیٰ۔ رافضیوں نے اس طرح کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل و رسوا کرے۔

۴۔ احیاء العلوم میں ہی انہوں نے لکھا کہ اگر کوئی رافضی ہمارے پاس آئے اور کسی شخص پر قتل کا الزام عائد کرے اور اپنے لیے بدلہ لینے کا استحقاق ثابت کرے تو ہم کہیں گے کہ تیرا اپنا قتل کیا جانا حلال ہے تو دوسرے سے قصاص کا طلبگار کیونکر ہوسکتا ہے؟ قال فیه انه لو جاء الینا رافضی وادعی انه لطلب دم عند احد قلنا ان دمك هدر۔ (انوارِ نعمانیہ جلد ثانی صفحہ ۲۸۵ ۲۸۶)

کتاب سر العالمین علامہ جزائری کی نظر میں

حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق شیعہ کے عظیم محدث کا نقطۂ نظر معلوم کر لینے کے بعد اب اس کتاب کے متعلق اس کی رائے معلوم کریں۔

نعم ربما نسب الیه کتاب یسمی سر العالمین فیه مقالة یظهر منها میله الی الحق ونطقه به لیکون حجة علیه وبعضهم انکر کون الکتاب له اوان المقالة الملحقة بالکتاب۔

(انوار نعمانیہ جلد ثانی صفحہ ۲۸۶)

ہاں بعض دفعہ اُن کی طرف ایک کتاب کی نسبت کی جاتی ہے جو کہ سرالعالمین کے نام سے موسوم ہے، اس میں ایک مقالہ ہے، جس میں ان کا حق کی طرف یعنی مذہب شیعہ کی طرف میلان اور اس کے ساتھ تعلق ظاہر ہوتا ہے تاکہ اس پر حجت و برہان بنے اور بعض علماء نے اس کتاب کا غزالی کی تصنیف ہونے کا انکار کیا ہے اور یا یہ کہ یہ مقالہ الحاقی ہے، یعنی اسے روافض نے اپنی طرف سے لکھ کر کتاب میں درج کر دیا ہے۔

جواتری صاحب کا انتقال سنہ ۱۱۱۲ھ میں ہوا ہے اور انہوں نے اس کتاب کی نسبت کا مشکوک ہونا اپنے قول من بما نسب الیہ کتاب ...... سے ظاہر کر دیا، کیونکہ فعل مجہول کے ساتھ نسبت کی تعبیر اس نسبت کے ضعیف اور ناقابل اعتماد و اعتبار ہونے کی دلیل ہے اور متداول کتب اور معروف و متواتر مؤلفات و مصنفات سے روافض کا رد اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا عقیدہ نقل کر کے جتلا دیا کہ ان کا حقیقی اور واقعی مذہب جو ان متداول و معروف کتابوں میں ہے، وہ رفض و تشیع کے رد و ابطال پر مبنی ہے اور جس کتاب میں روافض اور اہل تشیع کے موافق عبارت موجود ہے۔ وہ ساری کتاب یا اس کا وہ مقالہ من گھڑت ہے اور ناقابل انتساب اور وہ لائق اعتماد و اعتبار نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آپ ڈھکو صاحب کو داد دیں، جو پندرھویں صدی میں پھر اسی رسوائے زمانہ غیر معتبر اور ناقابل قبول کتاب سے استدلال پیش کر رہے ہیں اور بالکل خوفِ خدا اور شرمِ خلق سے بے نیاز ہو کر۔

الغرض ڈھکو صاحب کا امام غزالی علیہ الرحمۃ پر یہ بہتان عظیم ہے اور اس کو حقیقت اور واقعہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے اور نہ ان کی متواتر و معروف کتابیں اس کی تائید کرتی ہیں، بلکہ جس طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول شاذ اور مشہور حدیث میں تعارض ہو تو اعتبار مشہور کا ہو گا نہ کہ شاذ کا۔ اسی طرح امام غزالی علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب اس شاذ بلکہ موضوع و من گھڑت عبارت کا ان مشہور و متداول کتب کے اندر بالصراحت مذکور عقائد و نظریات کے مقابل کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

ڈھکو صاحب کی بے اصولی

تفسیر حسن عسکری کے حوالہ کا جواب دیتے ہوئے ڈھکو صاحب نے کہا تھا کہ اس کتاب کی نسبت حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کی طرف مشکوک ہے لہذا جب تک اس کے مندرجات کی تائید و تصدیق دوسری صحیح اور مستند روایات سے نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے مندرجات سے استدلال و استشہاد درست نہیں ہے لیکن جو قاعدہ اور ضابطہ اپنے لیے وضع کرتے ہیں اور اسے اصولِ مناظرہ قرار دیتے ہیں اہل سنت کے خلاف جوابی کارروائی میں اس کو مقبول جانتے ہیں بلکہ دیدہ دانستہ نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ ع ——— "ہر چہ برائے خود نہ پسندی برائے دیگراں مپسند" مسلّم قانون ہے۔ لیکن علامہ موصوف صرف چند ورق سیاہ کرنے کو ہی اپنا منتہائے مقصود قرار دیئے ہوئے ہیں، ہر چند سراسر بے اصولی پر ہی مشتمل کیوں نہ ہوں۔

حدیثِ قرطاس کی تیسری توجیہ کے جواب میں علامہ ڈھکو صاحب کی کیا دی مکاری

تیسری توجیہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے شیعی استدلال کے ابطال میں یہ ذکر فرمائی تھی کہ حدیث قرطاس میں اِیْتُوْنِیْ جمع کا صیغہ ہے جس میں گھر کے اندر موجود تمام افراد کو مخاطب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ چلو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرما بھی دیا، حسبنا کتاب اللہ یعنی ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے، لہذا اس دوران آپ کو آپ کو تکلیف نہ دو۔ تو سوال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر عمل کرنا تھا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر؟ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے کاغذ اور قلم اور دوات پیش کیے تھی

اب علامہ ڈھکو صاحب کے جوابات اور اُن کا رد ملاحظہ فرمائیں،

شق اوّل: اس کا پہلا جواب علامہ صاحب یہ دیتے ہیں کہ صیغہ "ایتونی" ضرور جمع مذکر کا ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں داخل نہیں؛ بلکہ یہ خطاب ان کے لیے ہے جن کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ ہادی مہدی تھے اور کائنات کو صراطِ مستقیم پر چلانے والے تھے، لہٰذا ان کو یہ تحریر لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟ سبحان اللہ! کیا خوب جواب ہے۔ اس کو پڑھ کر ارسطو، افلاطون اور بُوعلی سینا بھی دم بخود رہ جائیں۔ اقول وباللہ التوفیق:

۱۔ جس طرح حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تحریر لکھوانا چاہتے تھے، مگر اپنے فائدہ کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لیے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لیے اس کو لکھوا لیتے۔ آخر دوسری کتابیں بھی تو لکھی ہوئی تسلیم کی جاتی ہیں جن میں ستر ستر ہاتھ لمبائی والے صحیفے بھی ہیں، تو وہ کس لیے ہیں؟ ہدایتِ خلق کے لیے یا گمراہی کے لیے؟

۲۔ اس ہادی خلائق نے قرآن مجید کیوں لکھا تھا؟ اپنی ہدایت کے لیے یا لوگوں کی ہدایت کے لیے؟ جو مصلحت قرآن مجید کے لکھنے میں تھی، کیا وہی مصلحت یہاں موجود نہیں تھی؟ آپ خود تو بقول شیعہ ازلی مومن اور عارف تھے۔

۳۔ پھر سوال یہ نہ تھا کہ کس کی ہدایت مطلوب تھی؟ سوال یہ ہے کہ حکم کس کا تھا اور تعمیل کس نے نہیں کی لیکن ثابت ہو گیا کہ کاغذ، قلم دوات پیش نہ کرنے اور تعمیلِ ارشاد نہ کرنے میں سبھی برابر رہے ع ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

۴۔ اگر اس عقیدہ و نظریہ کے تحت عملی طور پر تعمیلِ حکم نہ کرنا جائز تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہی کچھ کیا جو اس عقیدہ و نظریہ کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا آپ نے ذرا اس عقیدہ و نظریہ کو ظاہر کر دیا اور حسبنا کتاب اللہ کہہ دیا۔ یعنی ہمیں ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے، لہٰذا ان کو بھی ضرورت نہیں تھی اور جن کو اللہ تعالیٰ نے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم

الاسلام دینا۔ کا مژدہ سُنایا (یعنی میں نے آج کے دن (۹ ذوالحجہ کے دن) تم پر اپنی نعمت کامل و مکمل کر دی اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو بطورِ دین پسند کیا) لہٰذا وہ تمام صحابہ کرام مستثنیٰ ہو جانے چاہئیں، تو پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور حکم کا مخاطب کس کو ٹھہرایا جائے گا، کیونکہ جن کی مغفرت و بخشش اور اُن کے اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے اور اللہ تعالیٰ کے اِن سے راضی ہونے کا قرآن کریم گواہ ہے۔ وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح مستثنیٰ ہی ٹھہریں گے۔

۵۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید و رسالت پر لبیک کہنے کی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت تھی؟ نعوذ باللہ اور کفار کے ساتھ حرب و قتال کی تیز ہجرت وغیرہ کی؟ کیونکہ آپ تو پہلے سے مومن تھے اور بقولِ شیعہ حضرات پنجتن پاک عالمِ ارواح و نورانیت میں اور روزِ اوّل سے ایمان و اخلاص میں بھی برابر کے شریک تھے، لہٰذا یہ دعوت بھی دوسروں کے لیے تھی اور اس کی تعمیل بھی دوسروں کو کرنی چاہیے تھی۔ خدا را سوچیے اتنا لغو اور بیہودہ جواب دینے کی کوئی ہوشمند آدمی جرأت کر سکتا ہے۔ ؎

خِرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خِرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

شق دوم: علامہ ڈھکو صاحب نے کہا جب بڑے پروانۂ رسالت نے آپ پر ہذیان کی تہمت لگا دی اور اکثریت نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، تو اس تحریر کا فائدہ کیا ہو سکتا تھا؟ جواب کی یہ شق بھی کئی وجوہ سے لغو و باطل ہے اور سراسر کیاری و مکاری۔

۱۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ اس کا فائدہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ سوال صرف یہ ہے کہ ارشادِ نبوی کی تعمیل ضروری تھی اور وہ بمعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی کی طرف سے بھی نہ پائی گئی۔ رہا فائدہ ہونے کا معاملہ تو وہ قرآن مجید سے بھی ہر ایک نے نہیں اٹھایا، خود اہل اسلام میں ایسے فرقے ہیں جو قول باری تعالیٰ یُضِلُّ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ کے مطابق اس کی وجہ سے گمراہ بھی ہوتے ہیں، جس کو ڈھکو صاحب چاہیں تو اپنی افتادِ طبع کے مطابق قرآن مجید کے نقصانات میں بھی شمار کر سکتے ہیں، مگر اس کا نازل کرنا سراسر حکمت اور یاد کرنا اور کرانا

اور جمع کرانا سب ہی اہم عبادات ہیں۔ لہٰذا زیادہ کے لیے نہ سہی، تھوڑوں کے لیے ہی، کچھ تو اس سے فائدہ اٹھاتے وقلیل من عبادی الشکور کے مطابق اہل حق کی تعداد کفار و مشرکین کے مقابل ہمیشہ تھوڑی رہی ہے، لہٰذا یہ کوئی صحیح توجیہ و تاویل عدم تعمیل کی نہیں ہو سکتی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے تبلیغی زمانہ کو دیکھو اور ان کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والوں کی تعداد کو بھی دیکھو تو پھر کہہ دینا چاہیے کہ اتنی قلیل تعداد کے لیے اس قدر اور اتنا عرصہ تکلیف برداشت کرنے اور کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں جس طرح کفار کے "انک لمجنون" اے نبی کہلانے والو! بے شک تم تو مجنون ہو کہنے کے باوجود آپ کے قرآن مجید اور کتاب حکمت نے آپ کی حکمت و دانائی کے سکے بٹھا دیے اسی طرح وہ تحریر مقدس اور اس کے فیوض و برکات، آپ کی حکمت اور دانائی کا نقش اہل عالم کے قلوب و اذہان پر مزید گہرا کر دیتی۔ کیا اس تحریر پر مترتب اس فائدہ اور انجام کار ہاتھ آنے والی برکات کو نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ جواز ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں کیونکہ نبی علیہ السلام کا کام تھا تعمیر ملت کی بنیاد رکھنا اور بعد ازاں وہ عمارت ان کے غلاموں کے ہاتھوں رشک ثریا ہو جاتی، لہٰذا فوری مصلحت کو دیکھنا اور انجام و عواقب کو نہ دیکھنا منصب نبوت و امامت کے سراسر خلاف ہے۔

۲۔ وہ تحریر بھی لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے پاس رکھ لیتے اور دوسرے راز ہائے درون پردہ کی طرح اس کو بھی شیعہ حضرات پر منکشف کر دیا جاتا اور ان کے ایمان کو لوہے کی لٹھ کی طرح مضبوط کر دیا جاتا اور ان کو مومنین در مومنین بنا دیا جاتا۔ جب حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریری سند خلافت بلا فصل پر صریح اور غیر مبہم الفاظ میں ان کے پاس موجود ہوتی، تو اہل السنت کی روایات کا سہارا لینے کی ضرورت ہی نہ رہ جاتی اور کھینچ تان کر ان سے مطلب برآری کی تکلیف سے نجات حاصل ہو جاتی۔

۳۔ سارے مہاجرین و انصار نہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ پر موجود تھے اور نہ ہی مسجد شریف میں، لہٰذا جب وہ تحریر انصار کو دکھلا دی جاتی تو یقیناً

سقیفائی اور شورائی خلافت کا تیا پانچہ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ جب وہ خود خلافت نہیں لے رہے تھے، تو حکمِ نبوی کی مخالفت کر کے اپنی دُنیا و آخرت کیونکر خراب کر سکتے تھے اور یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ مانا اور آپ کی خاطر بدری صحابہ طلحہ و زبیر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی جنگ کرنے سے گریز نہ کیا، جبکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پاس ہوتا، تو روزِ اول میں ہی جنگِ جمل والا منظر پیش آسکتا تھا، لیکن افسوس ہزار افسوس مدعی ہی سُست نکلا، یہ گواہ بیچارے سوائے مکاری اور ہیرا پھیری کے کیا کر سکتے ہیں۔

۴۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعوذ باللہ من ہذا البہتان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہذیان کا الزام عائد کیا تھا، تو اب وہ حکیمانہ تحریر وصول کرنا اور ہر امر مصلحت و منفعت پر مشتمل وہ وثیقہ حاصل کرنا مزید ضروری ہو گیا تھا تاکہ معترضین کا ناطقہ بند کیا جا سکتا اور اُس دَور کے لوگوں پر اور بعد میں آنے والی نسلوں پر ایسے لوگوں کے قلبی احوال کی نشان دہی کا ایک بیّن ثبوت ہوتا اور ان کے مقامِ نبوی سے بے خبر بلکہ اس کے مخالف ہونے کی قوی سند ہوتی، لیکن عملی طور پر ان کے ساتھ اتفاق کر کے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی ان کے اس زعم کی تصدیق کر دی نعوذ باللہ یا کم از کم یہ امکان اور احتمال لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیا کہ ذاتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہذیان طاری ہو سکتا ہے اور ان کا ہر حکم ماننا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ بعض دفعہ اس کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ!

دعویٔ ہذیان درحقیقت ہذیان ہی ہے

یاد رہے کہ اہل السنت کی کسی کتاب میں قطعاً یہ مذکور نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف ہذیان کی نسبت کی تھی۔ آپ نے صرف خالص ہمدردی کی بنا پر مشورہ دیا، قد غلبہ الوجع وعندکم کتاب اللہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے، لہٰذا اس وقت آپ کو

یہ تکلیف نہ دی جائے، مگر مطابق قولِ سعدی علیہ الرحمہ ؎

چشمِ بد بین کہ برکندہ باد | عیب نماید ہنرش در نظر

ڈھکو صاحب اور جملہ شیعہ برادری کو سراسر خلوص و محبت پر مبنی یہ مشورہ اعتراض و انکار ہی معلوم ہو اور جن لوگوں نے "أَهَجَرَ" کا لفظ استعمال کیا ہے وہ استفہامِ انکاری کے طریقہ پر ہے "أهجر استفهموه" کیا آپ بلا مقصد یہ کلام فرما رہے ہیں۔؟ اچھی طرح آپ سے سمجھ لو۔ اس عبارت سے اس توہم کا شدت اور سختی سے انکار کرنا مقصود ہے کہ آپ کی زبانِ اقدس پر بے مقصد کلام جاری ہو گیا ہو اور اس طرح کے استفہامِ انکاری کلامِ مجید میں بھی وارد ہیں جیسے أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ تو اس میں صحیح الفکر اور صاحب الرائے شخص کے وجود کا انکار مقصود ہے اور قول باری تعالیٰ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ۔ تو اس میں بھی اس امر کا انکار مقصود ہے یعنی تمہارے مفروضہ معبودات میں کوئی بھی ایسے کام کرنے والا نہیں ہے علاوہ ازیں اگر کسی جگہ کسی روایت میں استفہامی کلمہ بطریقِ صراحت مذکور نہیں تو مقدر ہے جیسے کہ قولِ ابراہیم علیہ السلام قرآن مجید میں منقول ہے کہ آپ نے ستارے کو دیکھا تو فرمایا هَٰذَا رَبِّي" پھر چاند کو دیکھا تو فرمایا "هَٰذَا رَبِّي" بعد ازاں سورج کو دیکھا تو فرمایا هَٰذَا رَبِّي هَٰذَا أَكْبَرُ۔ حالانکہ ظاہری طور پر اس کلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان اقوال کے دوران مشرک ہونا لازم آتا ہے اور اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ پیغمبر کی ذات ابتدائے ولادت سے دعوائے نبوت تک کفر و شرک سے منزہ و مبرا ہوتی ہے لہٰذا یہاں کلمہ استفہام مقدر ماننا لازمی اور ضروری ہے۔ یعنی أَهَٰذَا رَبِّي۔ کیا یہ میرا رب ہے اور مقصد اس کی ربوبیت کا انکار ہے اور قرآن مجید محاوراتِ عرب کے مطابق نازل ہوا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ استفہام انکاری میں بھی حرفِ استفہام کا مقدر ہونا معروف اور شائع و ذائع تھا، لہٰذا کسی صحابی پر بھی یہ اعتراض کرنا بالکل غلط ہے اور بہتان محض ہے۔ یہی تحقیق محققین علماء اسلام نے بیان فرمائی ہے جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعۃ اللمعات جلد چہارم صفحہ ۶۲۳ پر فرمایا: "ایں کلام محمول بر استفہام انکاری

است واگر در بعضے روایات حرفِ استفہام مذکور نباشد مقدر است۔ یعنی یہ کلام استفہامِ انکاری کے معنی میں ہے اور اگر بعض روایات میں حرفِ استفہام مذکور نہیں ہے، تو صرف لفظ کے لحاظ سے محذوف ہے۔ نیت و ارادہ میں ہے اور ہر صورت میں معنی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے مقصد کلام نہیں فرما رہے، بلکہ اس کی تعمیل ضروری ہے اور یہ کلام بھی ان حضرات کی طرف سے بطورِ دلیل پیش کیا گیا جو اس وقت کاغذ اور قلم و دوات پیش کر کے تحریر حاصل کرنا چاہتے تھے تو وہ کس طرح ہذیان کی نسبت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر سکتے تھے اور دوسرا فریق محض ہمدردی اور اخلاص کی بنا پر اس شدید درد کی حالت میں آپ کو تکلیف دینے سے گریز کر رہا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کر رہا تھا۔ ان کا قول تو صرف یہ تھا قد غلبہ الوجع وعندکم کتاب اللہ۔ اس کے یہ معنی کس لغت میں ہیں کہ آپ ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ العیاذ باللہ! بلکہ اس کا تو صرف اور صرف یہ معنی ہے کہ آپ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہدایت موجود ہے جس کی تفسیر و تشریح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرصہ مدید اور زمانہ بعید سے پڑھتے آ رہے ہو۔

نیز ان کے لیے اس اعتقادِ جازم اور یقینِ کامل کی کوئی صورت ہی نہ تھی کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مرض اور تکلیف کے دوران وصال فرما جائیں گے بلکہ ان کی امیدیں اور آرزوئیں یہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عاجلہ عطا فرمائے گا اور حسبِ سابق آپ سے تعلیم حاصل کر لیں گے اور وہ ضروری اور اہم امور معلوم کر لیں گے اور اگر لکھوانے ضروری ہیں، تو بعد میں لکھوا لیں گے۔

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے، وہ وحی الٰہی سے ہوتا تھا، کما قال اللہ تعالیٰ: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ لہٰذا یہ حکم فوری اہمیت کا حامل نہ ہوتا، تو آپ اس درد و الم میں اس کو زبانِ اقدس پر کیوں لاتے؟

جواب: اگر آپ کا بولنا وحی الٰہی کے تابع ہے، تو آپ کا سکوت و اعراض

بھی اس کے مطابق ہے، وہ اس کے خلاف کیسے سمجھا جا سکتا ہے ۔ نیز احکام صرف فرائض و واجبات میں ہی منحصر نہیں ہوتے مستحب اور اولیٰ و انسب بھی ہوتے ہیں اور ان کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے سوال کر لینا محل اعتراض نہیں ہو سکتا اور اگر حتمی اور لازمی امر ہوتا تو آپ اس پر اصرار فرماتے لیکن آپ نے ان کے استفسار پر فرمایا، مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو ۔ میں جس حال میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو حالانکہ تحریر لازمی ہونے کی صورت میں آپ کی طرف سے یہ جواب نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ اس صورت میں یہ تحریر فرائضِ رسالت میں داخل ہوتی اور اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی ۔

چوتھی توجیہ کے جواب میں ڈھکو صاحب کی حقائق پر پردہ پوشی

حدیثِ قرطاس سے شیعی استدلال کے ابطال میں چوتھی وجہ حضرت شیخ الاسلام نے یہ بیان فرمائی تھی کہ فرض کر لیتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، گو اس کا ذکر روایت میں نہیں ہے، مگر جب آپ فرما رہے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ بلا فصل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہو گا اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) دیکھو تفسیر صافی، تفسیر قمی، تفسیر حسن عسکری اور دیگر تمام معتبر تفاسیر۔ تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمان کے خلاف یا اپنے ارشادات کے خلاف کوئی دوسری خلافت بھی لکھ سکتے تھے ۔

شق دوم : اس کے جواب میں ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کے متعلق خلافتِ حقہ کا اظہار آپ نے نہیں فرمایا تھا بلکہ خود بخود ان کے خلافت و حکومت پر قابض ہو جانے کی خبر دینا مقصود تھا جیسے کہ خروجِ دجال کی خبر دی ۔ نہ اس کو خلافت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے ان کی خلافت کا برحق ہونا ثابت ہو سکتا ہے ۔

الجواب : وعلی اللہ الاعتماد ۔ علامہ ڈھکو حضرت صدیق و فاروق

(رضی اللہ عنہما) کے اعلانِ خلافت کو دجال کے خروج کے اظہار و اعلام کے مماثل قرار دے رہے ہیں، جو سراسر جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور حقائق کو پردہ پوشی۔ ہم پہلے وہ آیت کریمہ پیش کرتے ہیں۔ پھر شیعی مفسرین کے اقوال پیش کر کے قارئین کے عدل و انصاف پر یہ فیصلہ چھوڑ دیں گے کہ آیا ان کی دیانت و امانت اور عدالت و انصاف یہی کہتے ہیں کہ یہ خلافت اسی قسم کی پیشگوئی تھی جیسے خروجِ دجال کی خبر یا برحق خلافت کا اظہار و اعلام تھا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا، واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثاً فلما نبأت بہ واظہرہ اللہ علیہ عرف بعضہ و اعرض عن بعض قالت من انباءک ھذا قال نبأنی العلیم الخبیر۔ اور اس وقت کو یاد کرو، جبکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے بعض کو راز کی بات بتلائی تو جب انہوں نے وہ آگے بتلا دی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر مطلع فرما دیا، تو آپ نے اس میں سے بعض کے افشا کے متعلق انہیں جتلایا اور بعض کے جتلانے سے گریز کیا۔ اس نے دریافت کیا کہ آپ کو کس نے بتلایا؟ تو آپ نے فرمایا، مجھے ظاہر و باطن کا علم اور خبر رکھنے والے نے بتلایا ہے۔

اور قرآن مجید نے اس راز کے افشا کرنے اور زوجہ محترمہ کو وہ راز بتلانے کی وجہ بھی بتلا دی کہ آپ اس بیوی کو خوش کرنا چاہتے تھے اور اسے رضامند کرنا چاہتے تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ، یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک۔ یعنی اے نبی! آپ اس چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام ٹھہراتے ہو؟ اور اس سے باز رہنے کی کیوں قسم کھاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہے۔ تم اس تحریم کے ذریعے اپنی بیویوں کو خوش کرنا چاہتے ہو اور اُن کی رضامندی کے طلب گار ہو۔

اور اس روایت کے نقل کرنے میں تمام شیعی تفاسیر اور مفسرین متفق ہیں کہ

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے آپ پر حرام ٹھہرا لیا تھا تاکہ حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما راضی ہو جائیں کیونکہ اُن کے گھر میں اور اُن کی باری میں حضور سرورِ عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطیہ کے ساتھ مباشرت فرمائی تھی جس سے وہ غمزدہ ہو گئیں اور اس فعل کو اپنے حق اور احترام کے منافی سمجھا لہٰذا آپ نے اُن کو خوش و خرم کرنے کے لیے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو حرام ٹھہرایا اور ساتھ ہی اُنھیں یہ بھی بتلا دیا: ان ابابکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم ابوک۔ تفسیر قمی ص۳۵۵ تفسیر صافی ص۲۲۳ ج۲ تفسیر منہج الصادقین ص۳۳۲ ج۹ تفسیر مجمع البیان ص۳۱۴ ج۵ وغیر ذالک۔ یعنی میرے بعد خلیفہ بلا فصل ابوبکر صدیق اور پھر تمہارے باپ عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔

اس پس منظر میں اس روایت کا صاف اور واضح مطلب و مفہوم یہی ہے کہ یہ امارت و خلافت اور حکومت و سلطنت اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا کے عین مطابق ہے نہ کہ اس کے منافی و مخالف اور غاصبانہ و ظالمانہ ورنہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے اس میں خوشخبری کونسی ہو سکتی تھی اور ان کی دل جوئی اور رضامندی کے لیے بطورِ مژدہ اس راز کا انکشاف ان پر کیوں کیا جاتا، جس طرح دجال کا خروج و ظہور، ڈھکو صاحب اور اس کے ہم مشرب لوگوں کے لیے مژدہ و خوشخبری نہیں، حالانکہ غیبی خبر ضرور ہے۔ اسی طرح ظالمانہ اور غاصبانہ خلافت و امارت غیبی خبر تو ہو سکتی تھی لیکن اس کو بطورِ مژدہ و خوشخبری سنانا اور اس کے ذریعے پریشان اور غمزدہ ام المومنین کو خوش کرنے کی سعی اور کوشش فرمانا کسی بھی معقول انسان کے نزدیک درست نہیں ہو سکتا۔

الغرض کلام مجید اور احادیث رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سیاق و سباق اور پیش منظر اور پس منظر میں بہرحال شیخین بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بھی بقول بعض شیعی مفسرین کے، خلافتِ حقہ اور امارت و سلطنتِ مطلقہ کی خبر دے رہے ہیں۔

علی الخصوص جب یہ حقیقت ذہن نشین رکھی جائے کہ جس طرح آج کے قرآن خواں کو یہ تجسس اور جستجو ہوتی ہے کہ وہ راز کیا تھا اور اس کا انکشاف حضور نبی اکرم سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس پر کیا اور اس نے کس کو بتلایا۔ پھر جس قدر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے افشائے راز سے متعلق جتلایا 'وہ کیا ہے؟ اور جس حصہ سے اعراض اور رُو گردانی فرمائی' وہ کیا ہے؟ تو لا محالہ اس دور میں ہر قرآن خواں کو یہ جستجو اور تجسس پیدا ہونا لازم تھا اور اس کے متعلقہ امور سے باخبر ہونے کی خواہش اور طلب ہر دل میں ضرور پیدا ہوتی ہوگی اور کونسا عقلمند انسان ہے جو یہ باور کر سکے کہ خواص اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مفسرین صحابہ اور علی الخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسی ہستیاں بھی ان سے بے خبر ہوں، بلکہ حتمی اور قطعی طور پر ان کو یہ تمام تفصیل معلوم ہونا لازم اور ضروری ہیں، بلکہ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے بیعتِ خلافت کے لیے ہاتھ بڑھانے اور یہ منصب بذاتِ خود سنبھالنے کے لیے عرض کیا گیا، تو آپ نے فرمایا میرا اس وقت بیعت لینا کچے پھل کو توڑنے اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے مترادف ہے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس عہد کا پابند کیا گیا ہوں کہ میں ان خلفاء کی اطاعت کروں ـــــــ لہٰذا ڈھکو صاحب کا یہ دعویٰ کہ خلافتِ شیخین کا اعلان و اظہار محض دجال کے خروج جیسی پیشین گوئی ہے۔ اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے، جب خروجِ دجال کی پیشین گوئی اور ضیبی خبر سے اُن کو بھی فرحت و شادمانی حاصل ہو سکے اور یہ خبر سُن کر اُن کے سارے غم و آلام دُور ہو جائیں، لیکن ایسی خبر اگر کسی کے لیے سوہانِ رُوح ہو اور وہ اسے سُن کر لرز اٹھے تو اس کی مسرت و شادمانی اور دل جوئی و رضامندی کے لیے اسے یہ خبر نہیں سنائی جا سکتی۔ بعینہٖ اسی طرح ظالمانہ اور غاصبانہ حکومت و خلافت جو ظالم و غاصب کے لیے عذابِ الیم کی موجب ہوا کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ظالم و غاصب کے عزیز و اقارب کو خوش نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کو کوئی خوشی اور مسرت حاصل ہو سکتی ہے، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ کم از کم حضور

سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خلافت و امارت کو غاصبانہ اور ظالمانہ نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو بتلایا کہ وہ ظالمانہ حکومت ہوگی اور نہ آپ نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس لیے بتلایا تھا کہ وہ اس حکومت و خلافت کو ظالمانہ سمجھیں۔ ہاں شیعہ حضرات کو بالعموم اور ڈھکو صاحب کو بالخصوص کہیں دوسری جگہ سے الہام ہوگیا ہو اور یہ مخفی راز ان پر منکشف ہوگیا ہو تو ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے، کیونکہ علم و آگہی کا دوسرا ذریعہ بھی موجود ہے۔ کما قال تعالیٰ ان الشیاطین لیوحون الی اولیاء ھم۔ بے شک شیاطین اپنے دوستوں اور احباب و اولیاء کی طرف وحی کرتے ہیں۔ لہٰذا اس امر کا یقین رکھنا ضروری ہے کہ ان حضرات کی طرف سے یہ دعویٰ سراسر الہامی ہے۔ اگرچہ ذریعہ اس کا سراسر شیطانی ہے کیونکہ شیاطین کا اس خلافت کے خلاف سرگرم عمل ہونا ان کا فطری تقاضا تھا اور ان خلفاء راشدین نے اسلام کی ترویج و اشاعت اور تائید و تقویت کا اہتمام کرکے فارس کے آتش کدے ٹھنڈے کرکے اور صلیب کی پرستش ختم کرکے انہیں بہت دکھ پہنچایا تھا اور رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل بنائے ہوئے جھوٹے نبیوں کا صفایا کرکے ان کی ساری تدبیریں خاک میں ملا دی تھیں، لہٰذا وہ کس طرح اس خلافت کو بنظرِ تحسین دیکھ سکتے تھے اور ان کے لیے یہ حکومتِ الٰہیہ کیونکر قابلِ قبول اور قابلِ برداشت ہو سکتی تھی، لہٰذا انہوں نے انسانوں میں سے اپنے بھائی، دوست بلکہ محبوب و مطلوب تلاش کیے، اور اس خلافت کے متعلق اپنی بے چینی اور قلق و اضطراب سے انہیں آگاہ کرکے ان سے اپنے زخمی دلوں کی مرہم پٹی اپنے درد کا درماں طلب کیا اور ان حضرات نے دوستی اور قلبی تعلق کا حق ادا کرتے ہوئے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ خود شیاطین بھی سر پیٹ کر رہ گئے ہوں گے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تنبیہ: ہماری اس گزارش سے علامہ ڈھکو صاحب کے ایک اور دعوے یعنی شق اول کا کھوکھلا پن اور اس کی لغویت بھی واضح ہوگئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے

(حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اگر سید عرب و عجم صلی اللہ علیہ وسلم خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، تو وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تھی کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے اعلام و اطلاع سے جان چکے تھے کہ میرے بعد خلیفہ بلافصل ابو بکر صدیق ہوں گے پھر حضرت عمر اور آپ بطورِ مژدہ و خوشخبری حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر اس کا انکشاف بھی کر چکے تھے، تو اپنے اعلان و اظہار اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے برعکس آپ کوئی دوسری خلافت کیسے لکھ سکتے تھے۔ علامہ ڈھکو صاحب نے کہا پیر صاحب کا یہ قول و کلمۃ حق اُرید بہا الباطل کے ضمن میں آتا ہے اور قیامت تک آپ کا یہ مقصد ثابت نہیں ہو سکتا کہ شیخین کی خلافت منشاء ایزدی کے مطابق ہے، حالانکہ آیت مبارکہ کے سیاق و سباق۔ قسم کھانے کے پس منظر سے اور اس کے بعد اپنی زوجہ محترمہ کی دلجوئی اور تسلی و اطمینان کے لیے خلافتِ فاروقیہ کا مژدہ سنانے سے تو لازمی طور پر یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خلافت منشاء ایزدی کے عین مطابق تھی اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی منشاء و مرضی کے بالکل مطابق، کیونکہ اسی پر دینِ اسلام کا رائج اور مستحکم ہونا موقوف تھا اور ترویج و ترقی پانا اور اطراف و اکناف عالم میں پھیلنا وغیرہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ ابن ابی الحدید معتزلی شیعی کو اعتراف کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کا اسلام اور اہلِ اسلام پر خصوصی کرم اور لطف تھا کہ صحابہ کرام کو خلافت کی اس ترتیب کا الہام کیا، ورنہ اسلام کبھی پھل پھول نہ سکتا اور قبل ازیں اس خلافت کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عندیہ اور نظریہ بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ خلافت وہی خلافت ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض۔ الآیہ میں وعدہ فرمایا ہے لہٰذا اس پس منظر میں اس کا منشاء ایزدی اور مرضی رسول کے مطابق ہونا روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے اور حضرت قبلہ پیر صاحب کا یہ فرمان حقیقت واقعیہ کا بیان صداقت نشان ہے اور کیوں نہ ہو آپ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اولاد و امجاد سے ہیں، لہٰذا آپ ان کے نظریہ و عقیدہ سے کیونکر منحرف ہو سکتے ہیں، بلکہ الولد سر لابیہ

کے تحت آپ عقائد و نظریات کے لحاظ سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عقائد و نظریات کے امین تھے اور انہیں کو آپ نے بڑے مدلل انداز میں بیان فرمایا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

شق سوم: علامہ ڈھکو صاحب کے جواب کی تیسری شق یہ تھی کہ پھر اہل سنت اس خلافت کو اجماعی اور شورائی کیوں قرار دیتے ہیں، نصی کیوں قرار نہیں دیتے؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو پہلے ابوبکر اور ان کے بعد حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) کے خلیفہ بننے کی خبر دے دی تھی، لیکن جواب کی یہ شق بھی بوجوہ لغو اور باطل ہے اور بغض و عناد اگر کسی کو اندھا اور بہرہ کر دے، تو پھر اس کا کیا علاج ہے؟

۱۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ سرورِ انبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برسرِ منبر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا تاکہ اس کو نصی خلافت قرار دیا جاتا، لیکن اس طرح کا اعلانِ عام نہ کرنے کے باوجود یہ تسلیم کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ آپ نے بطورِ رازداری جو کچھ بیان فرمایا، وہ بھی صرف آپ کا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد وہی تھا، کما قال تعالیٰ: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کیونکہ آپ اپنی مرضی اور خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، بلکہ آپ کی زبان پر وحیِ الٰہی اور کلامِ خداوند تعالیٰ جاری ہوتا ہے۔ علامہ صاحب ہی بتلائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ عام کیے بغیر صرف دو تین خدام اور حاضرینِ مجلس کو جو کچھ بتلائیں اس کا اعتبار نہیں ہے اور اسے آپ کا ارشاد اور فرمان کہنا غلط ہے؟ اور وہ فرمان وحیِ الٰہی اور کلامِ خدا کہلانے کا حقدار نہیں ہے؟ ہاں اس کو نصی خلافت اس لیے نہیں کہتے کہ اس کی صورت یہ ہوتی کہ آپ عام اہلِ اسلام کے سامنے کسی صحابی کے خلیفہ ہونے کا اعلان کرتے اور انہیں اس خلیفہ کی اطاعت اور اتباع کا پابند اور مکلف ٹھہراتے لہٰذا بایں معنی نصی بھی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق بھی ہے۔

۲۔ نیز ہم اس خلافت و امامت کو اجماعی اور شورائی قرار دیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور پسندیدگی کو دخل نہیں، بلکہ رضائے خلق، رضائے خالق کا مظہر اور عنوان ہوا کرتی ہے، لہٰذا اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اجماع و اتفاق اور ان کی اس خلافت پر رضا مندی بھی اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مرضی کی مظہر ہے اور یہی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے، جس کا جواب دینے کی علامہ صاحب کو ہمت نہ ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں :۔

انما الشوریٰ للمہاجرین والانصار فان اجتمعوا علیٰ رجل وسموہ اماماً کان ذالک للہ رضیً۔ نہج البلاغۃ

یعنی شوریٰ اور انتخابِ خلیفہ کا حق مہاجرین اور انصار کے لیے ہے اور وہ جس شخص کو بھی باہمی رضا مندی اور اتفاق و اتحاد سے خلیفہ نامزد کر دیں، تو وہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ امام اور خلیفہ ہوگا، لہٰذا یہ خلافت شورائی اور اجماعی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق ہے اور اعلانِ عام نہ فرمائے جانے کی وجہ سے نصی نہ کہلائے گی، مگر بطور مژدہ اور خوشخبری اس ترتیبِ خلافت کا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر اظہار ان حضرات کی خلافتِ الٰہیہ موعودہ اور خلافتِ حقہ کی دلیل بھی ہے۔ اس کے نص خلافت نہ ہونے سے اس کا بطلان اور خلافِ واقع ہونا کس طرح لازم آگیا یا ظالمانہ خلافت والا مفہوم کیسے اور کس طرح یہاں سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

شق چہارم : ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ اعلانِ خلافت تو اتنا اہم تھا کہ اس کے بغیر تمام کارِ نبوت اکارت ہونے کا اندیشہ تھا، کما قال اللہ تعالیٰ : وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ۔ اور یہاں افشائے راز پر دل ٹیڑھے ہو رہے ہیں، لیکن یہ شق بھی سراسر دھوکہ بازی اور فریب کاری پر مبنی ہے اور بے بنیاد اور خلافِ حقیقت دعویٰ ہے۔

ا۔ یہ دعویٰ کہ اعلانِ خلافت کے ضمن میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے، شیعہ و روافض کا خود تراشیدہ نظریہ ہے، جس کو حقائق اور واقعات سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ خلافتِ مطلقہ اور ریاستِ عامہ کے مالک اور متولی کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اعلان تو دور کی بات ہے۔ مساجدِ مدینہ میں سے صرف ایک مسجدِ نبوی کے امام بلکہ نائب امام کے طور پر بھی ان کا اعلان شیعہ ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لیے بقولِ شیعہ امامتِ نماز کا معاملہ محلِ شک و تردد رہا اور صحابہ کرام ایک دوسرے پر ٹالتے رہے۔ اور جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کی آواز حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنی، تو باوجود شدید تکلیف کے خود تشریف لائے اور ان کو مصلے سے ہٹا دیا اور خود مصلّے پر امامت پر تشریف فرما ہو گئے، مگر اسی قول کو بھی ماننا لازم ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ اس وقت اپنے مصلّی پر کھڑا کیا اور نہ دوسرے کسی وقت میں ان کو نماز کی امامت کے لیے مامور فرمایا۔ جب اس محدود امامت اور امامتِ صغریٰ کے لیے نامزدگی ثابت نہیں ہو سکتی، تو امامتِ کبریٰ کے لیے کیسے آپ کی تخصیص اور نامزدگی ثابت کی جا سکتی ہے، بلکہ جب اس طرح کا اعلانِ خلافت آپ کے لیے ہو چکا ہوتا تو نماز میں امامت خود بخود ان کے لیے ثابت ہو چکی تھی۔ پھر انہوں نے اپنا حق کیوں استعمال نہ فرمایا اور مصلّیٰ کو خالی کیوں چھوڑا کہ خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر تکلیف برداشت کرنا پڑی اور بمشکل تمام مصلّیٰ خالی کرانا پڑا۔

الغرض اس آیتِ کریمہ کے متعلق مفصّل بحث تو حدیثِ غدیرِ خم میں ذکر کی جائے گی، وہاں ملاحظہ فرماویں۔ اجمالاً اتنا قدر یاد رہے کہ امامتِ عظمیٰ اور خلافتِ کبریٰ تو کجا آپ کی امامتِ صغریٰ کا اعلان بھی نہیں پایا گیا تھا تاکہ اس سے ہی امامتِ کبریٰ کا اشارہ سمجھ لیا جاتا جیسے کہ اہلِ سنت نے حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامتِ نماز سے یہ اشارہ سمجھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی وجہ تقدیم بیان کر کے انصار کو خلافتِ صدیق رضی اللہ عنہ پر متفق کر لیا اور وہ منا امیر و منکم امیر کے دعوے سے دستبردار ہو گئے

۲۔ رہا ڈھکو صاحب کا یہ دعویٰ کہ یہاں اس خلافت کے اظہار پر دل پُر طعے ہو رہے ہیں، سراسر خلافِ واقع اور مضحکہ خیز ہے، کیونکہ خود ان کے مسلک کی کتابوں میں یہ وضاحت و صراحت موجود ہے کہ جس امر کے افشار پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو سرزنش فرمائی۔ وہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے آپ پر حرام ٹھہرانے والا امر ہے نہ کہ حضرات شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کا انکشاف و افشائے راز چنانچہ قرآن مجید نے بھی خود اس راز کے بعض حصہ پر افشار کے متعلق خبر دینے اور بعض حصہ سے اعراض اور سہ گردانی کرنے کی تصریح فرمائی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ، فلما نبأت به واظهره الله عرف بعضه واعرض عن بعض۔ اور اس کی تفسیر میں علمار شیعہ نے کہا،

الف، عن الزجاج ولما حرم مارية القبطية اخبر حفصة أنه يملك من بعده ابوبكر ثم عمر فعرفها بعض ما افشت من الخبر واعرض عن بعض ان ابا بكر وعمر يملكان بعدى۔ (مجمع البيان ج ۹۔ ص ۳۱۴)

یعنی زجاج سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام فرمایا، تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو یہ خبر بھی دی کہ میرے بعد ابوبکر والی ملک و سلطنت ہوں گے اور ان کے بعد عمرؓ۔ پھر ان کے افشار کرنے پر اس امر میں سے بعض جتلایا، یعنی عائشہ صدیقہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کو بتلایا اور یہ خبر دینا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا دیا ہے اور بعض سے اعراض فرمایا، یعنی اس سے کہ

ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) میرے بعد امورِ سلطنت کے مالک ہوں گے۔
(وکذا فی التفسیر الصافی نقلاً عن مجمع البیان۔ جلد ثانی ص ۲۳۴)

ب: قولہ تعالیٰ: واذا اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثا سخنے را کہ تحریم ماریہ است وحکومت ابوبکر وعمر بعد از وے تا عرف بعضہ و اعرض عن بعض شناسا گردانید پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام برخے ازاں حدیث را بحفصہ وخبر داد اورا از افشاء بعض آنکہ آن تحریم ماریہ است یعنی باو گفت کہ قصۂ تحریم ماریہ کہ با سرار آن امر نمودہ بودم، تو افشاء آں نمودی و اعراض کرد رسول از بعض دیگر یعنی حکومت ابوبکر و عمر بن خطاب و تعریف افشاء آں نکرد۔ (منہج الصادقین جلد ۹ ص ۳۲۳)

اس عبارت کا بھی معنی و مفہوم وہی ہے، جو مجمع البیان والی عبارت کا ہے اور ذکر کیا جا چکا ہے۔

الغرض اگر ان حضرات کی حکومت و امارت اور خلافت و امامت کے انکشاف پر قول باری تعالیٰ: فقد صغت قلوبکما میں ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہوتا تو اس کو ذکر کیا جاتا اور علی الخصوص شیعی مفسرین تو لازماً اس کو درمیان میں لانے کی سعی کرتے۔ جب قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی شہادت سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس انکشاف و اظہار کو کلیۃً نظر انداز کر دیا گیا اور اس پر کسی قسم کی سرزنش تو کیا گلہ ہی نہیں دیا گیا تو ڈھکو صاحب کو یہ انکشاف کہاں سے ہو گیا کہ اس خلافت کے انکشاف پر بل پڑتے ہونے لگے ہیں؟ کیا وہی ذریعہ الہام ہے جو قول باری تعالیٰ: "اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیٰٓئِھِمْ" میں بیان کیا گیا ہے؟ یقیناً صرف اور صرف وہی ذریعہ انکشاف ہے۔

۳۔ بلکہ حقیقت حال یہ تھی کہ سوال یہ نہیں تھا کہ کیا بیان کیا اور کیا بیان نہیں کیا؟ تھوڑا کیا یا زیادہ بیان کیا۔ سوال صرف یہ تھا کہ تم نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہو اور امہات المومنین تمہارا لقب امتیاز اور طرۂ امتیاز ہے، لہٰذا تمہارا عمل و کردار

بھی اسی طرح اعلیٰ وارفع ہونا چاہیے اور جن کے صدقے تمہیں عزت وکرامت نصیب ہوئی ہے۔ ان کے احکام کی مکمل تعمیل ہونی چاہیے۔ لہٰذا افشاء راز کرنا اور راز کو راز نہ رکھنا تمہارے جیسے مقام و مرتبہ کی مالک عورتوں کو زیب نہیں دیتا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی تعلیم و تربیت تھی، اور ان کے اخلاق و اعمال کی تہذیب و تزئین، نہ کہ ان کی مذمت۔ لیکن یہ صرف شیعی ذہن کا فتور تھا کہ اس تعلیم و تربیت اور تادیب و تہذیب کو خلافت میں تنقیص و تنقید کا سبب بنا لیا اور اس کو ناصبانہ اور ظالمانہ خلافت فرض کر لیا اور یہ صرف سبائی ذہنیت کی ہی کارستانی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ افشاء راز خواہ وہ جیسا بھی ہو، مناسب نہیں ہوتا، نہ یہ کہ واقعہ کے مطابق اور برحق ہو تو اس کا افشاء درست ہوگا اور خلافِ واقعہ اور ناحق ہو تو اس کا افشاء ممنوع ہوتا ہے۔ لہٰذا ان غیر معقول سوالات کے بحمداللہ معقول جواب آچکے ــــ فھل من مدکر۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا تھا، ان ابا بکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم ابوک۔ اس کا ترجمہ یوں کرنا کہ وہ خود بخود قابض ہو جائیں گے، اور خلافت کو غصب کر لیں گے، یہ کس لغت اور کس محاورہ کے لحاظ سے ہے اور برحق خلیفہ بننے کی خبر دینا ہو تو اس کے لیے کونسی تعبیر متعین ہے؟ کسی جملہ سے قائل کی مراد متعین کرنے کی صورت یہی ہوتی ہے کہ اس کے ظاہری اور متبادر الی الفہم معنی کو دیکھا جائے اور ظاہر و متبادر بالکل وہی ہے، جو ہم نے بیان کیا اور حضرت شیخ الاسلام نے بیان فرمایا اور شیعی معنی نہ اس جملہ سے متبادر الی الفہم اور نہ اس پر کوئی قرینہ قائم ہوا، لہٰذا وہ سراسر تحریف ہے۔

۵۔ اگر امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وصال میں انتقالِ اقتدار فرما دیتے تو ان خلفاء کے لیے یہ موقعہ فراہم نہیں ہو سکتا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ نے عملی طور پر اقتدار منتقل کر کے خلافت مرتضویہ کا تحفظ کیوں نہ کیا اور اس میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء کے مطابق

عمل فرمایا یا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مرضی اور منشار کے مطابق؟ اور آپ نے اپنا فریضہ یعنی حقدار کو اس کا حق مہیا کرنے کا کیوں نہ ادا فرمایا اور اس موقعہ پر ان کی جانشینی کا اعلان کیوں نہ فرمایا؟

۶۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس کوئی فوج و سپاہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسے عظیم قبیلہ کے فرد تھے، جو امرِ خلافت میں ان کی امداد و اعانت کا حق ادا کرتے جس سے انہوں نے خود بخود خلافت و حکومت پر قابض ہونا تھا، بلکہ ان کی خلافت و امامت کا دار و مدار اہلِ حل و عقد کی بیعت پر تھا اور وہ مہاجرین و انصار تھے اگر وہ حضرات ان کی بیعت نہ کرتے، تو یہ خلیفے اور امام نہیں بن سکتے تھے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان کو تو والی اور حاکم بنایا گیا تھا نہ کہ خود بخود بنے تھے، لہذا اگر یہ معنیٰ کیا جائے جو ڈھکو صاحب نے کیا ہے، تو حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آتی ہے۔

علاوہ ازیں خلافت و امامت کا بذریعہ شوریٰ انعقاد پذیر ہونا درست ہے تو ان حضرات کی خلافت برحق ثابت ہوگئی اور نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی باطل ہوگئی، کیونکہ وہ بھی نص سے نہیں، بلکہ اسی شوریٰ اور مہاجرینؓ انصار کے انتخاب سے منعقد ہوئی تھی۔ بیعت کرنے والے نہ پہلے کسی نص کو جانتے تھے اور نہ بعد میں ———————— انہوں نے کسی نص کے ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ حقہ کو تسلیم کیا، بلکہ محض شورائی و اجماعی ہونے کی وجہ سے ہی اس کو برحق تسلیم کیا۔ لہذا یا تو چاروں خلافتیں برحق تسلیم کرنی پڑیں گی یا چاروں باطل، پھر اس تفریق کی وجہ جواز کوئی نہیں ہو سکتی۔

۷۔ جن لوگوں نے پہلے غصب کرانے میں خلفائے ثلاثہ کا مکمل تعاون کیا اور بعد ازاں بھی اسی نظریہ پر قائم رہے کہ ان کی خلافت برحق تھی اور اس کا از روئے شوریٰ و انتخاب انعقاد پذیر ہونا بالکل درست تھا، وہ مومن رہے یا مرتد ہوگئے؟ اگر مومن رہے، تو خلافتِ بلافصل کا عقیدہ رکنِ اسلام نہ رہا۔ اندریں صورت اس

پر کارِ نبوت کا توقف اور دار و مدار کیونکر ہو سکتا ہے اور خلافتِ مرتضوی کا اعلان نہ کرنے سے سب کارِ نبوت اکارت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور اگر مرتد ہو گئے تھے العیاذ باللہ! تو ان سے تعاون اور استمداد کا کیا جواز؟ نیز ان کو خوش کرنے کے لیے شیخین کی تعریف و توصیف بھی کرتے رہنے کا کیا جواز ہو گا، حالانکہ قبل ازیں متعدد حوالہ جات سے یہ حقیقت ثابت کی جا چکی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ علی الاعلان بر سرِ منبر حضرات شیخین کو ساری امت سے افضل قرار دیتے تھے۔ وغیر ذالک۔

۸۔ علامہ ڈھکو صاحب کے بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ وہ ازرہِ ظلم و تعدی خلافت پر قابض ہو جائیں گے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرمائیں وہ خلافت، خلافتِ موعودہ ہے اور خلافتِ الٰہیہ، تو اس صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کس پر فتویٰ لگایا جائے گا؟ اور شیعہ حضرات ان میں سے کس کو صادق اور کس کو کاذب کہیں گے؟ نعوذ باللہ من ذالک کیا منصبِ امامت پر فائز شخص تصدیقِ رسول کا پابند نہیں ہے؟ بلکہ اس کے لیے نبی کی تکذیب کرنا جائز ہے؟ العیاذ باللہ!

کیا ہیں ان معقول سوالات کے معقول جوابات کسی معقول شیعہ کے پاس؟ قطعاً نہیں، بالکل نہیں۔ انفرادی طور پر کجا، اجتماعی طور پر بھی ممکن نہیں ہیں۔

علماءِ شیعہ کی عداوتِ شیخین میں ہوش و خرد سے بیگانگی

شیعی مفسر قمی اور محسن کاشانی رقمطراز ہیں کہ جب خلافت کے متعلق یہ راز فاش ہو گیا اور ابوبکر صدیق اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) کو معلوم ہو گیا کہ واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "ان ابابکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم ابوک۔" تو انہوں نے دو آدمی دوسرے ساتھ ملا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلانے اور شہید کرنے کا پروگرام بنایا۔

فاجتمعوا اربعة على ان يسموا رسول الله صلى الله عليه وسلم فنزل جبرئيل عليہ السلام بهذه السورة (الى) عرف بعضه اى اخبرها وقال اخبرت بما اخبرتك وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ لم يخبرهم بما علم مما هموا به من قتله۔ (تفسیر قمی مع تفسیر حسن عسکری ۔ ص۳۴۵)

یعنی جب چار آدمیوں نے آپ کو زہر دے کر شہید کرنے کا پروگرام بنایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی (تا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حصہ کے متعلق حضرت حفصہ (رضی اللہ عنہا) کو جتلایا اور باز پرس کی کہ تو نے آگے کیوں بتلایا' جو میں نے تجھے بتلایا تھا اور بعض سے چشم پوشی فرمائی یعنی یہ جان کر بھی کہ انہوں نے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا' انہیں اپنے جان لینے اور اللہ تعالیٰ کے جتلانے کا ذکر نہ کیا۔ (تفسیر صافی جلد دوم ص۷۲۳)

اقول ، اس اضافہ میں کئی وجوہ سے سقم ہے جو اس کے سراسر افتراء اور بہتان ہونے کی بین دلیل ہے۔

۱۔ جب انہیں معلوم ہو چکا کہ خلافت مل جائے گی' تو پھر آپ کو زہر کھلانے اور شہید کرنے کا پروگرام بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں یہ معلوم نہ ہوتا' تو ہاتھ پاؤں مارتے اور حیلوں وتدبیروں سے کام لینے کی ضرورت پڑتی علی الخصوص جبکہ ڈھکو صاحب کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ راہب کی اس پیشگوئی کی وجہ سے ہی اسلام لائے تھے کہ تم اس رسول کے خلیفہ بنو گے' تو اس علم کے مطابق پروگرام بنالیتے۔ اب اس تاخیر سے اور آپ کے اطلاع دینے کے بعد یہ پروگرام بنانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

۲۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل اور زہر خورانی کا منصوبہ اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کیا اتنی معمولی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان لوگوں کو توبہ کرنے کا حکم نہ دیا اور صرف حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ کو

حضرت ماریہ قبطیہ (رضی اللہ عنہن) کی تحریم کی خبر دینے پر توبہ کا حکم دیا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہ ان کو گلہ دیا اور نہ دوسرے مخلص صحابہ کو اس غلط اقدام کی اطلاع دی اور نہ ہی ایسے لوگوں سے تعلقات توڑے، نہ ان کی بچیوں کو طلاق دے کر فارغ کیا تاکہ لوگوں کو ان کے تعلقات اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقرب کی وجہ سے مغالطہ نہ لگے، تو کیا کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت ہے، اس کے تحت اس امر کو نظر انداز کیے جانے کے قابل سمجھ سکتا ہے؟ اور خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے بھیانک جرم کو جس کا تعلق نبی و رسول کی شہادت و قتل سے تھا، قابل عفو و درگزر سمجھ سکتے تھے؟

۳۔ نیز جب خلافت کے خواہشمندوں کے عزائم آپ کو معلوم ہو چکے اور ان کے ایسے مکروہ ارادے آپ پر واضح ہو چکے تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عملی طور پر خلافت سونپنا اور اپنی ظاہری زندگی میں اقتدار کو منتقل فرما دینا زیادہ ضروری اور لازم ہو چکا تھا، لیکن آپ نے اس سے اعراض اور روگردانی کر کے گویا عملی طور پر خلافت مرتضوی کا راستہ مسدود کر دیا، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات عداوت شیخین میں ہوش و خرد اور عقل و فہم سے بالکل بیگانے ہو چکے ہیں اور ان کی سوچ اور فکر کی صلاحیتیں ہی ختم ہو کر رہ گئی ہیں، ورنہ یقیناً ہوش و حواس اس قسم کی روایات کیونکر گھڑی جا سکتی ہیں۔

اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ کی عداوت میں بے حیائی کی انتہا

(ب) قمی صاحب اور محسن کاشانی صاحب لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے حرام ٹھہرانے کے بعد فرمایا، انا افضی الیک سرًا فان انت اخبرت بہ فعلیک لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین فقالت نعم ما ھو؟ قال ان ابابکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم من بعدہ ابوک قالت من انباءک ھذا قال نبأنی العلیم الخبیر (تفسیر قمی مع العسکری ص۳۵۶، تفسیر صافی جلد دوم ص۷۲۳)

یعنی میں ایک راز تیرے تک پہنچانے لگا ہوں اور اس کا افشا کرنے والا ہو، پس اگر تونے اس کی کسی کو خبر دی تو تجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو گی۔ اس کے تمام فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی۔ تو انہوں نے کہا ہاں ٹھیک ہے! فرمایئے وہ راز کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا، بے شک میرے بعد ابوبکر والی خلافت ہوں گے اور اس کے بعد عمر۔ تو انہوں نے دریافت فرمایا آپ کو اس کی اطلاع کس نے دی؟ تو فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے، جو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔

اقول ، اس روایت میں بھی کئی وجوہ سے افترا اور بہتان واضح ہوتا ہے۔

۱۔ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرعی احکام سے ہٹ کر ان کو ایسے راز کے تحفظ کا مکلف ٹھہرانا، جس کے افشاء و اظہار پر ان کو اس قدر شدید لعنت کا حقدار بننا پڑے، کونسی رحمت کا مظاہرہ ہے؟ اور ان کے لیے کونسی خوشخبری کا موجب ہو سکتا ہے، جبکہ عورتوں کے طبعی ضعف اور صبر و تحمل کی قلت کا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حکیم اور معلمِ حکمت سے بڑھ کر کس کو اندازہ ہو سکتا ہے؟

۲۔ راز افشا کرنے کے باوجود اور ایسی شدید و مغلظ لعنت کے حقدار ہونے کے باوجود ان کو امہات المومنین میں شامل رکھنا اور زوجہ بنا کر رکھنا خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتنا شدید اور غلط تاثر پیدا کر سکتا ہے؟ اور لوگوں کی نظروں میں آپ کا مقام کیا چھوڑے گا؟ کیا فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی بیویوں کا انتخاب کر رکھا تھا؟ العیاذ باللہ

۳۔ یہ خبر دینے پر کہ میرے بعد ابوبکر صدیق خلیفہ ہو گا اور پھر عمر فاروق، یہ سوال کرنا کہ تمہیں کس نے اطلاع دی ہے، اس کا کیا موقعہ محل ہو سکتا ہے؟ کیا ایسی غیبی خبروں کی اطلاع دینے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا تھا؟ اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن اس سے بے خبر ہو سکتی تھیں، لہذا اس صورت میں اس سوال کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ الغرض ہر طرح تحریف ہی تحریف مطمحِ نظر معلوم ہوتی ہے۔

۴۔ من انباءك هذا اور نبأني العليم الخبير کو ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کی اطلاع کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے، حالانکہ قرآن مجید اس راز کو فاش کرنے کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف پر ان کا یہ سوال نقل کر رہا ہے، کیونکہ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے بھی آپ کو اطلاع دیئے جانے کا امکان تھا جنہیں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے یہ راز بتلا دیا تھا، لہذا آپ کا اس موقعہ پر یہ سوال برمحل تھا اور معقول بھی مگر آپ نے تسلی کرا دی کہ مجھے عائشہ صدیقہ نے نہیں بتایا، بلکہ اللہ علیم و خبیر نے بتلایا ہے، لیکن شیعی مفسر نے بالکل بے موقعہ و بے محل تفسیر کر کے تحریف معنوی کا ارتکاب کیا ہے اور اہل تورات کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیعہ حضرات نے روایات میں کس قدر تحریف اور تغییر و تبدیل سے کام لیا ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین صحابہ کو اور امہات المومنین کو کس قدر اپنی بدباطنی اور بغض و عناد کا نشانہ بنایا ہوا ہے اور اس بغض و عناد میں کس قدر اندھے ہوتے جا رہے ہیں اور لازم آنے والے مفاسد سے کس طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں، البتہ جو خاندانی ہیں یا قدرے شعور کے مالک، وہ ایسی روایات نقل کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں، جیسے طبرسی صاحب مجمع البیان۔

ڈھکو صاحب کی جاہلانہ اور بے محل تنقید

جو کتاب یا رسالہ شائع ہوتا ہے، اس کی کتابت مصنفین نہیں کرتے بلکہ انہیں کاتب حضرات لکھتے ہیں اور وہ بعض اوقات کچھ کا کچھ لکھ جاتے ہیں، بالخصوص عربی کو۔ کیونکہ عربی سے ان کو واقفیت بہت کم ہوا کرتی ہے اور خود ڈھکو صاحب کے رسالہ میں اس طرح کی شدید غلطیاں موجود ہیں، مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو با غیان شریعت لکھ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو صـ۳۰) لہذا ڈھکو صاحب کا رسالہ مذہب شیعہ میں کاتب کی غلطی سے وَلَا تَخُطُّهُ کی جگہ ولا تخطوہ لکھے جانے کو حضرت

شیخ الاسلام قدس سرہ کی طرف نسبت کرنا اور کہنا کہ اس سے ان کی قرآن دانی پر تیز روشنی پڑتی ہے، انتہائی جاہلانہ اور سوقیانہ انداز اور سراسر غلط اور بیجا اعتراض ہے۔ آپ بحمد اللہ حافظ قرآن بھی تھے اور عربی لکھنے اور بولنے میں کامل دسترس رکھتے کے مالک، جس کو صرف موافق ہی نہیں، بلکہ مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا صاحب علم اور شریف لوگوں کو اس قسم کے اعتراض زیب نہیں دیتے، گو علامہ ڈھکو صاحب ایسے اعتراضات سے باز نہ ہی رہیں گے اور نہ ہی رہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کی افتادِ طبع اور مجبوری ہے۔

رسالہ مذہب شیعہ — از شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حدیث غدیر اور شیعی استدلال کا ابطال

اسی طرح یہ بھی ابلہ فریبی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کی دلیل کے طور پر غدیر خم کی روایت پیش کی جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ یعنی جس کا میں دوست ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے دوست ہیں۔ ظاہر ہے قرآن حکیم میں مولی بمعنی دوست وارد ہے۔ دیکھو آیت کریمہ: فان اللہ ھو مولاہ وجبرئیل وصالح المؤمنین "یعنی اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا دوست خود اللہ تعالیٰ شانہٗ ہے اور حضرت جبرئیل اور نیک بندے" والملائکۃ بعد ذالک ظہیر۔ ان کے بعد فرشتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امداد کنندہ ہیں۔

اب مولیٰ کا معنی حاکم یا امام یا امیر کرنا صراحۃً قرآن مجید کی مخالفت ہے اور تفسیر بالرائے اور کونسا مسلمان نہیں مانتا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کے دوست ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے

شیعہ کے ۲۲ سوالات کا

تحقیقی محاسبہ

از قلم

مناظر اسلام ترجمان مسلک رضا مبلغ اہل سنت

حضرت علامہ ابو حذیفہ محمد کاشف اقبال مدنی

مدظلہ العالی

کرمانوالہ بک شاپ

اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے علی رضی اللہ عنہ رات جب تک میں نہ آؤں فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مخصوص کام نہ کرنا۔ (جلاء العیون صفحہ ۱۳۰، فارسی ۱/۲۵۱ مترجم اردو تہذیب المتین ۱/۸۲)

زرارہ شیعہ مذہب کا بنیادی راوی کہتا ہے کہ اگر میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی باتیں بیان کروں تو لوگوں کے عضو تناسل تن جائیں گے۔ (رجال کشی ۱/۳۴۹)

پھر کتب شیعہ میں امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کا یزید کی بیعت کر لینا مرقوم ہے۔
(کتاب الروضہ ۳/۱۱۰، ملحقہ فروع کافی رجلاء العیون صفحہ ۵۰۰)

اس طرح کی سینکڑوں گستاخیاں ان کی کتب میں موجود ہیں کیا یہ محبت اہل بیت ہے۔ اہل بیت کے حقیقی محب اہل سنت ہیں اور شیعہ اہل بیت کے حقیقی دشمن اور جھوٹی محبت کے دعوے دار ہیں۔

8- سرکار سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حسبنا کتاب اللہ کہنے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع مبارک کی رعایت مقصود تھی۔ اس سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالی کو رد کرنا مقصود نہ تھا۔ امام بیہقی نے یہی تحریر کیا ہے۔ (دلائل النبوت ۷/۱۸۴)

سرکار عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مقصود تو صرف اتنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت مبارکہ میں راحت و سکون آ جائے۔ شدت زائل ہونے کے بعد تحریر لکھوائی جائے، پھر سرکار عمر رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ اگر اس موقع پر غلط تھا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سکوت کیوں اختیار فرمایا۔ اس پر انکار کیوں نہ فرمایا۔ اس لیے کہ اللہ کے نبی امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کسی منکر اور معصیت پر ہرگز سکوت نہ فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ اس پر انکار فرمایا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرکار عمر رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ اس موقع غلط نہ تھا۔ پھر حسبنا کتاب اللہ سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ سنت نبوی و ارشادات کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حسبنا اللہ و نعم الوکیل کا یہ مطلب و مفہوم ہرگز کوئی عقل مند نہ لے گا کہ اللہ کافی ہے اور رسول کی نبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہذیان کا جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا شیعہ کی نری بکواس ہے۔ اس لیے کہ ھجر استفھموہ کے الفاظ سے ہذیان مراد نہیں، ان کی خباثت

ہے۔ محدثین کرام فرماتے ہیں ھجر، یھجر کے معنی فراق اور جدائی کے ہیں۔ یہاں صحابہ کرام کی مراد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی ہے۔ اور اگر بفرض غلط وہی مانا جائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیگر روایات میں اھجر کے الفاظ ہیں انہوں نے بطور استفہام انکاری کے استعمال کیا ہے، استفہام تقریری کے نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن صحابہ کرام نے یہ جملہ بولا ہے انہوں نے ہذیان کے انکار کے طور پر ذکر کیا ہے، نہ کہ اثبات کے طور پر۔ اس لیے اس جملے کے کہنے والے وہ حضرات تھے جو تحریر کے حق میں تھے اور جو تحریر کے حق میں نہ تھے وہ ان کے قول کا رد کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہذیان ہرگز نہیں ہوا، اس لیے ہمیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ عالی کے موافق قرطاس حاضر بارگاہ کرنا چاہیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا، اس قول کے قائل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ تھے بلکہ دیگر اور حضرات تھے۔ اس لیے کہ یہ جملہ قالوا کے بعد آیا ہے۔ جب روایات میں قال کی بجائے قالوا مذکور ہے اور اگر اس کو استفہام تقریری کے طور پر تسلیم کیا جائے تو ھجر اور استفھموہ عبارت بے ربط اور بے جوڑ ثابت ہوگی۔ ثابت ہو گیا کہ یہاں استفہام انکاری مراد ہے۔ اسی کو امام کرمانی نے امام نووی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ (کرمانی شرح بخاری ۱۶/۲۳۵)

یا یہ ھجر حقیقی طور پر ھجر فراق جدائی اور ہجرت کے معنی میں ہے جیسا کہ اوپر بھی مذکور ہوا، جو وصل کی ضد ہے۔ یعنی کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیائے فانی سے ہجرت فرما رہے ہیں۔ یعنی ہجر کا فعل ماضی سے اطلاق و استعمال کیا ہے اس کا یہ معنی قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

واھجرھم ھجرا جمیلا۔ (مزمل:۱۰)

"اور ان کو خوبی کے ساتھ چھوڑ بیٹھو، اور میل کچیل کو دھو ڈالا"۔

واھجرنی ملیا۔ (مریم:۴۶)

"اور ایک عرصے کے لیے مجھ سے جدا ہو جا"۔

ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔ (فرقان:۳۰)

''میری قوم نے قرآن کو بالکل چھوڑ دیا تھا''۔

واھجرو ھن فی المضاجع۔ (نساء:۳۴)

''اور ان کے بستروں پر ان کو چھوڑ دو''۔

والرجز فاھجر۔ (مدثر:۵)

''اور میل کچیل کو دھو ڈال''۔ (ترجمہ مقبول)

امام ابن حجر عسقلانی بھی یہی لکھتے ہیں کہ ھجر کے معنی چھوڑ دو۔ یہ لفظ وصل کی ضد ہے۔ ھجر کا یہ معنی زیادہ صحیح ہے۔ (فتح الباری ۹/۱۹۸)

اس معنی کے درست ہونے کی دو دلیلیں ہیں:

اولاً تو حضور سید عالم ﷺ نے ایام علالت میں ارشاد فرمایا کہ کاغذ قلم لاؤ، تاکہ میں تمہیں تحریر لکھ دوں۔ جس کی وجہ سے تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اس میں کون سی بات خلاف عقل ہے۔ جس کو ہذیان کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکے۔

ثانیاً ھجر کے بعد استفھموہ ہے۔ اگر ھجر کے معنی ہذیان کے ہوں تو استفھموہ کے ساتھ ربط بالکل غلط ہو جاتا ہے اور بر سبیل تنزل اگر ھجر کے معنی ہذیان کے تسلیم کر لیے جائیں۔ تو بخاری شریف میں سات جگہ یہ حدیث آئی ہے۔ اور ہمزہ استفہام کے ساتھ اور دیگر کتب حدیث میں بھی ہمزہ استفہام کے ساتھ مذکور ہے۔ تو اس اعتبار سے معنی وہ ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یعنی حضور اقدس ﷺ کے حکم مبارک میں توقف کیوں کرتے ہو۔ حضور ﷺ کو ہذیان ہرگز نہیں ہوا۔ اس معنی سے بھی اعتراض کی بنیاد ختم ہو گئی۔

شیعہ کو چاہیے کہ وہ سند صحیح ثابت کریں کہ یہ مقولہ سرکار عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔

ھجر کا معنی ہذیان کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس معنی کے سوا کوئی دوسرا معنی یہاں چسپاں نہیں ہو سکتا۔

ہماری قدرے تفصیلی قدرے گفتگو سے شیعہ کے اعتراض کا جواب ہو گیا اب آخر میں ہم اپنے مختار معنی فراق جدائی کے ثبوت میں ایک مرفوع حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول

اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

ج۔ لا یحل المسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاثۃ ایام او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام۔ (ابوداؤد ۲/۳۱۷)

"کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے کسی دینی بھائی سے تین دن سے زیادہ گفتگو ترک کرے"۔

تو کیا یہاں ہجر کے معنی ہذیان اور بکواس کے ہوں گے کہ کسی مسلمان کو تین دن سے زیادہ گالی بکنا جائز نہیں ہے۔ ایسا مفہوم کوئی شیعہ ہی لے سکتا ہے جس کا عقل سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ (حدیث قرطاس پر ہم نے کتاب الجنائز میں تفصیلی لکھا ہے)

۵۔ سرکار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بغض میں کس قدر چالاکی اور عیاری سے سوال مرتب کیا ہے ورنہ خلافت صدیقی تو خود کتب شیعہ سے بھی ثابت ہے۔ تدفین سے قبل ہی ہر نبی کے خلیفہ پر اُمت کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور نبی کے اس خلیفہ کی موجودگی میں ان کی تجہیز و تکفین کا بندوبست ہوتا تھا۔ ورنہ کوئی شیعہ بتائے کہ کسی پیغمبر کی تدفین خلیفہ کے تقرر و تعین کے بغیر ہوئی ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ دیگر انبیاء کی مثال بے موقع محل پر نہیں ہے اس لیے کہ وہاں ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر اس کا خلیفہ بنتا تھا۔ اس کی نبوت و خلافت پر نص جلی کا ہونا ضروری تھا۔ مگر شریعت محمدیہ کئی اصول و فروع میں ان سے مختلف ہے۔ یہاں تو اس شریعت کے صاحب حضور اقدس ﷺ پر نبوت ختم کر دی گئی۔ لہٰذا آپ ﷺ کا خلیفہ مثل انبیاء کے خلفاء کے نہیں ہے۔ یہاں نص جلی کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط نص خفی اور پیشن گوئی کے ساتھ اُمت کا اتفاق کافی ہے۔ مگر سابقہ اُمم کی طرح یہاں بھی یہی اصول ہے کہ اُمت قائد و خلیفہ کے بغیر نہ ہو۔ چنانچہ مزاج شناسان رسول ﷺ اور فضلاء دبستان نبوت صحابہ کرام نے تدفین سے قبل چند لمحات میں سرکار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے یستخلفنھم فی الارض کا وعدہ باری تعالیٰ سچ کر دکھایا۔

عمرو بن حریث نے سرکار سعید بن زید رضی اللہ عنہ من عشرہ مبشرہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ

ﷺ کے وصال باکمال کے وقت آپ موجود تھے۔ فرمایا: ہاں۔ عمرو نے عرض کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کب ہوئی۔ فرمایا حضور اقدس ﷺ کے وصال باکمال کے روز صحابہ کرام نے اسے مکروہ جانا دن کا کچھ حصہ بغیر جماعت ماتحت خلیفہ کے رہیں اس نے عرض کیا کہ کیا کسی نے مخالفت بھی کی۔ فرمایا نہیں۔ اس نے عرض کیا کہ کیا مہاجرین میں سے کوئی پیچھے رہا۔ فرمایا نہیں۔ بلکہ تمام مہاجرین نے خود بیعت کر لی۔

اگلی متصل روایت میں ہے سرکار علی رضی اللہ عنہ اس وقت گھر میں تھے جب ان کو خبر ملی۔ تو آپ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور تاخیر کو ناپسند کیا اور بیعت کر کے آپ کے پاس بیٹھے رہے۔ (طبری ۳/۲۰۷)

خود شیعہ کے ہاں یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی یا امام کا خلیفہ اس کے آخری لمحات میں بنایا جاتا ہے۔ اصول کافی میں ہے کہ اس سوال کہ عہدۂ امامت کب ملتا ہے، کے جواب میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پہلے امام کی زندگی کے آخری لمحات میں۔ (اصول کافی ۱/۲۷۵)

سرکار علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہی سرکار امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے منبر پر جلوہ گر ہو کر خطبہ دیا پھر حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ منبر سے اترے، تو حاضر لوگوں نے آپ کی بیعت امامت کی۔ (جلاء العیون صفحہ ۳۱۹)

جب شیعہ مذہب میں امام پہلے کی شہادت و موت کے بعد ہی امام بن جاتا ہے اور اس کی بیعت بھی ہو جاتی ہے تو سرکار اقدس ﷺ کے خلیفہ کے تقرر پر کیا اعتراض ہے۔ حالانکہ یہ سنت انبیاء ہے۔ پھر خلیفہ کا تقرر اس لیے بھی ضروری تھا کہ منافقین اور دیگر دشمنانِ اسلام کے منصوبوں کی وجہ سے اہلِ اسلام کو خطرہ تھا۔ اور اس لیے بھی کہ امت کا ہر کام خلیفہ کی نگرانی میں ہو۔ کسی امر میں اختلاف نہ ہو جائے، شورش نہ ہو۔ اس موقع پر سرکار دو عالم ﷺ کی تدفین مبارکہ میں اختلاف پیدا ہو گیا تو سرکار صدیق رضی اللہ عنہ کے ارشاد نبوی پیش کرنے پر اختلاف رفع ہوا۔ (شمائل ترمذی صفحہ ۲۷، طبری ۳/۲۱۳)

حضور اقدس ﷺ نے اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق وصایا سرکار صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی

خلافت صدیقی، صدیق اکبر کی افضیلت، حدیث قرطاس کا جواب، باغ فدک، جنگ صفین، جنگ جمل کیوں ہوئی؟ حضرت امیر معاویہ، حضرت ابوسفیان اور حضرت ہند پر اعتراضات کے جوابات، حضرت عائشہ پر اعتراضات کے جوابات، صحابہ کرام اور اہلبیت اطہار کی باہمی محبت کا ثبوت شیعہ حضرات کی کتابوں سے اور شیعہ حضرات کی شان صحابہ کرام میں گستاخیاں انہی کتابوں سے ملاحظہ فرمائیں

صحابہ کرام علیہم الرضوان کی حقانیت

مؤلف:
مولانا محمد شہزاد قادری ترابی

زاویہ
زاویہ پبلشرز
دربار مارکیٹ، لاہور

ہو۔ جناب امیر (علیہ السلام) نے وضو کیا اور مسجد میں تشریف لائے۔ خالد بن ولید بھی پہلو میں آ کھڑا ہوا۔ اس وقت ابوبکر نماز پڑھا رہے تھے (جلاء العیون اردو جلد اول، ص213، سطر 20-21، مطبوعہ لاہور)

سوال نمبر 5: کیا پیغمبر علیہ السلام جناب علی (رضی اللہ عنہ) کی خلافت تحریر فرمانا چاہتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کاغذ، قلم و دوات طلب فرمائی تو انہوں نے نہ دی بلکہ یہ کہا کہ رسول پاک ﷺ ہذیان کہتا ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی غلطی کی؟

جواب: جھوٹوں پر خدا کی لعنت، آپ کی پہلی ہی غلط ہے۔ اہل اسلام میں کی کتب میں اس کے برعکس لکھا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام اپنے مرض الموت میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تحریر فرما گئے تھے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ شریف ص555 پر واضح الفاظ موجود ہیں نیز اس طعن کرنے سے اتنا پتہ چل گیا کہ غدیر خم کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ مقرر نہیں ہوئے تھے اور عید غدیر منا کر شیعہ لوگ خواہ مخواہ بدنام ہو رہے ہیں۔ آپ کا یہ دعویٰ پیغمبر علیہ السلام نے کاغذ، قلم، دوات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طلب فرمائی تو یہ بھی جھوٹ ہے بلکہ آپ نے جمیع حاضرین سے (جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور گھر کی خواتین وغیرہ بھی شامل ہیں) کاغذ، قلم، دوات طلب فرمایا۔ جیسا کہ بخاری شریف کتاب الجزیۃ باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب، ص426، رقم الحدیث 2932 میں ہے)

فقال ائتونی بکتف اکتب لکم کتاباً

یعنی حضرت اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کتف لاؤ تاکہ میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ جس کے بعد تم راہ حق کو نہ گم کرو۔

غور فرمایئے۔ حدیث میں "ائتونی" صیغہ جمع مذکر مخاطب بول کر پیغمبر علیہ السلام جمیع حاضرین سے کتف طلب فرما رہے ہیں، نہ کہ فقط حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اور ان سے طلب ہی کیوں فرماتے جبکہ وہ ان کا گھر ہی نہ تھا کہ جس میں قلم دوات طلب کی گئی بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا۔ جیسا کہ بخاری شریف جلد 1 ص 382 پر ہے اور پھر اگر قریب تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر لہٰذا اگر خاص طور پر فرماتے تو ان سے کہ جن کا گھر قریب تھا۔ (تمام شیعہ متفق ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گھر مدینہ شریف کے آخری کونہ پر تھا) بہرحال نقل و عقل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے

پیغمبر علیہ السلام نے قلم، دوات طلب نہیں فرمائی۔

2......آپ اس کا کیا جواب دیں گے کہ حضور اکرم ﷺ اس واقعہ کے تین دن بعد تک حیات رہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے باوجود بھی ان کی تعمیل حکم نہ کر سکے اور بقول شیعہ خلافت بھی انہی کی تحریر ہونی تھی اور ادھر حکم رسول بھی تھا۔ لہذا اگر باقی سب صحابہ مخالف تھے تو ان پر لازم تھا کہ چھپے یا ظاہر ضرور لکھوا لیتے تا کہ بعد میں یہی تحریر پیش کر کے خلیفہ بلا فصل بن جاتے مگر یہ سب کچھ نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ تو تحریر ہی سرے سے ضروری نہ تھی بلکہ ایک امتحانی پرچہ تھا کہ جس میں حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق فرمایا ورنہ آپ پر حق اور وحی چھپانے کا الزام عائد ہوگا، حالانکہ جماعت انبیاء اس سے بالاتر ہے۔

3......اگر یہ ضروری تحریر تھی یا وحی الٰہی تھی اور کاغذ دوات نہ لانے والا خواہ مخواہ ہی مجرم ہوا تو اس جرم کے اولاً مرتکب اہل بیت قرار پاتے۔ اس لئے کہ وہ ہر وقت گھر میں رہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کا گھر باقی صحابہ کی نسبت قریب تھا اور اگر وہ مجرم نہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مجرم نہیں۔ لہذا شیعوں کا یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کاغذ اور دوات حضور ﷺ نے طلب فرمائی، باطل ہوا۔

سوال نمبر 6: کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (العیاذ باللہ) حضور اکرم ﷺ کی طرف ہذیان کی نسبت کی؟

جواب: یہ بھی جھوٹ اور افتراء ہے بلکہ بخاری شریف کتاب الجزیۃ، باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب، ص 426، رقم الحدیث 2932 پر یوں موجود ہے۔

فقالوا ماله اهجر استفهموه

یعنی حاضرین نے کہا کہ حضور ﷺ کا کیا حال ہے۔ کیا آپ ﷺ دنیا سے ہجرت فرمانے لگے ہیں۔ آپ سے دریافت تو کرلو۔

اور عبارت میں ''قالوا'' بصیغہ جمع مذکر غائب موجود ہے لہذا پہلی جہالت تو شیعوں کی یہ ہوئی کہ صیغہ جمع سے ایک شخص واحد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مراد لے لیا۔ دوسری جہالت یہ کہ ''ہجر'' کا معنی برخلاف عربیت بلکہ برخلاف سباق وسیاق ہذیان لکھ مارا حالانکہ ''ہجر'' بمعنی ہذیان کیا جائے تو آگے ''استفهموه'' کا کوئی مطلب نہیں ہوسکتا کیونکہ شیعوں کے ماسویٰ کوئی عقلمند بھی نہیں ملے گا کہ پہلے کسی کو مخبوط الحواس اور مجنون سمجھ لے اور پھر اس سے اس کے ہذیان کا مطلب پوچھنے لگے، بہرحال

صیغہ "استفھموہ" نے بتادیا کہ "اھجر" کے معنی وہی دار دنیا سے جدا ہونے کا ہی ہے، نہ کچھ اور......

2...... اگر "ہجر" بمعنی ہذیان بھی تسلیم کرلیا جائے تو بھی مفید نہیں کیونکہ "اہجر" میں ہمزہ استفہام انکاری موجود ہے کہ جس سے نفی ہذیان مفہوم ہو رہا ہے معنی یہ ہوگا کہ کیا حضورﷺ کوئی ہذیان فرمار ہے ہیں۔نہیں ہرگز نہیں بلکہ ہوش سے فرمار ہے ہیں ذرا دریافت تو کرلو بہرکیف حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ویسے ہی اس مقولہ کے قائل نہ تھے، باقی رہے قائلین تو چونکہ "ہجر" بمعنی ہذیان ثابت نہیں ہوا۔ اگر ہوا تو بوجہ ہمزہ استفہام منتفی ہوگیا لہذا وہ بھی اس سے بری ہوگئے۔

سوال نمبر 7: اگر یہی بات ہے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "حسبنا کتاب اللہ" کیوں کہا؟

جواب: اول تو اکثر روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ ہی نہیں شمار ہوا۔

2...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ بخوبی جانتے تھے کہ اللہ کا دین اور قرآن پاک کا نزول مکمل ہو چکا ہے کہ جس پر "الیوم اکملت لکم دینکم" شاہد ہے پس آپ نے گمان کیا کہ حضورﷺ کا یہ حکم وحی الٰہی کی وجہ سے نہیں اور وجوب نہیں بلکہ بطور مشورہ ہے تو آپ نے بطور مصلحت اور مشورہ عرض کردیا کہ یارسول اللہﷺ آپ تحریر قرطاس کی تکلیف نہ فرمائیں۔ کتاب اللہ کو ہمارے لئے کافی سمجھیں جس پر حضورﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موافقت ظاہر فرمائی اور تحریر قرطاس پر زور دینے والوں کو ڈانٹ دیا۔ چنانچہ بخاری شریف کتاب الجہاد والسیر، باب ہل یستشفع الی اہل الذمۃ ومعاملتھم، جلد 10، ص 268، رقم الحدیث 2825 پر ہے۔ **دعونی فالذی انا فیه خیر مما تدعونی الیه** حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کلام میں قرآن کو مسلمان کے لئے کافی ہونا کا بیان کیا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہج البلاغہ جلد 3 ص 57 پر ہے "**واللہ واللہ فی القرآن**" نیز کتاب مذکور جلد 2 ص 27 پر ہے "**فاوصیک بالاعتصام بحبله**" اور جلد 2 ص 22 پر ہے "**ومن اتخذ قوله دلیلا هدی**" دیکھئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ہدایت کے لئے قرآن کو کافی قرار دیا۔ لہذا اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے انکار بالسنۃ لازم نہیں آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے لازم کیوں آئے گا؟ اگر بربنائے نیتی و مصلحت مشورہ دینا رسول اللہﷺ کی نافرمانی ہرگز نہیں ہے۔

جنگ حدیبیہ کے موقع پر حضورﷺ نے فرمایا۔ اے علی اسے مٹایئے (لفظ "رسول اللہ" کے بارے میں) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پیغمبر علیہ السلام کو صاف جواب دیا کہ میں اسے ہرگز نہیں مٹاؤں گا۔ جب رسول اللہﷺ نے وہ الفاظ اپنے ہاتھ مبارک سے مٹادیئے۔ اگر اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نافرمان نہیں کہا جاسکتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی نہ

کہا جائے کیونکہ بر بنائے مصلحت وحکمت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم نبوی کی خلاف ورزی کی ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلاف ورزی کی ہے، نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلکہ وہی ہوا جو رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے۔

فضائل عمر از لسان حیدر رضی اللہ عنہ

شیعہ صاحبان خواہ مخواہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ جبکہ ان کی کتابوں میں مذکورہ ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان فرمائے۔ جب خلیفہ ثانی عمر رضی اللہ عنہ نے روم پر چڑھائی کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو آپ نے فرمایا کہ نواحی اسلام کو غلبہ دین سے بچانے اور مسلمانوں کی شرم رکھنے کا اللہ ہی کفیل ہے۔ وہ ایسا خدا ہے جس نے انہیں اس وقت فتح دی جب ان کی تعداد نہایت قلیل تھی اور کسی طرح فتح نہیں پا سکتے تھے۔ انہیں اس وقت مغلوب ہونے سے روک رہا ہے جب یہ کسی طرح روکے نہیں جا سکتے اور وہ خداوند عالم حی لایموت ہے۔ اب اگر تو خود دشمن کی طرح کوچ کرے اور تکلیف اٹھائے تو پھر یہ سمجھ۔ لے کہ مسلمانوں کو ان کے اقصائے بلاؤ تک پناہ نہ ملے گی اور تیرے بعد کوئی ایسا مرجع نہ ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں لہذا تو دشمن کی طرف اس شخص کو بھیج جو کارآزمودہ ہو اس کے ماتحت ان لوگوں کو روانہ کرو جو جنگ کی سختیوں کے متحمل ہوں اور اپنے سردار کی نصیحت کو قبول کریں۔ اب اگر خدا غلبہ نصیب کرے گا تب تو وہ چیز ہے جسے تو دوست رکھتا ہے اور اگر اس کے خلاف ظہور میں آیا تو ان لوگوں کا مددگار اور مسلمانوں کا مرجع تو موجود ہے

(نیرنگ فصاحت، ص19)

ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عربی کلام کا ترجمہ شیعہ حضرات کی کتاب "نیرنگ فصاحت" سے لیا ہے تاکہ ان کو یہ عذر نہ ہو کہ ترجمہ میں دست اندازی کی گئی ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس کلام سے حسب ذیل امور ثابت ہوئے ہیں۔

1...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پورا اعتماد تھا۔ ہر معاملہ میں ان سے مشورہ لیا جاتا ورنہ یہ مُسلّم ہے کہ کوئی شخص اپنے دشمن سے اس طرح کا مشورہ ہرگز نہیں لیا کرتا۔

2...... حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا ملجا و ماوا سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ نہ دیا کہ اس مہم میں بذات خود معرکہ کارزار میں جائیں۔ اگر خدانخواستہ باہمی کدورت ہوتی تو یہ مشورہ دیتے کہ آپ خود لڑائی میں جائیں تاکہ ان کا کام تمام ہو اور آپ کے لئے جگہ خالی ہو۔ اس بات سے ظاہر ہوا کہ

حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صادق دوست تھے۔

3...... حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کامیابی کو کامیابی اسلام تصور کرتے تھے۔ اس لئے ان کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارا اور مسلمانوں کا خود حامی و ناصر ہے۔ جب مسلمان تھوڑے تھے اس وقت بھی ان کی حفاظت فرمائی اور اب تو بفضل خدا مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے۔ پھر اس کی تائید و نصرت پر کیوں نہ بھروسہ کیا جائے۔ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کے کلام سے یارلوگوں کی اس من گھڑت بات کی بھی تردید ہوتی ہے کہ بعد از وصال رسول اللہ ﷺ صرف تین چار مسلمان ہی رہ گئے تھے۔ ایسا ہوتا تو آپ یوں فرماتے۔ پہلے مسلمانوں کی تعداد کثیر تھی، اب گنتی کے چند آدمی رہ گئے ہیں۔ ان کی اس مہم پر بھیجو تو فتح ہوگی ورنہ شکست۔

سوال نمبر 8: حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہما، حضور ﷺ کے وصال کے وقت حضور ﷺ کے جسم مبارک کو چھوڑ کر خلافت کے چکر میں پڑ گئے تھے جس سے تدفین میں تین دن تاخیر ہوئی؟

جواب: جب حضور ﷺ کا وصال ہوا تو نفاق نے سر اٹھایا، عرب کے کچھ لوگ مرتد ہو گئے۔ منکرین زکوٰۃ کا مسئلہ درپیش آ گیا اور انصار نے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ اتنی مشکلیں جمع ہو گئیں کہ اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جگہ پہاڑ پر بھی پڑتیں تو وہ بھی اس وزن کو برداشت نہ کر سکتا۔ لیکن اللہ اکبر، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی حکمت عملی سے ہر ایک مشکل کا مقابلہ کیا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جو صحابہ کرام علیہم الرضوان ایک لمحہ بھی حضور ﷺ سے جدا نہیں رہ سکتے تھے۔ آج وہ غم سے نڈھال ہیں۔ ان سب کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حوصلہ دیا۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ کی تدفین میں تاخیر ہوئی۔

☆...... حضور اقدس ﷺ کا جنازہ انور اگر قیامت تک کھلا رہتا تو اصلاً کوئی خلل واقع نہ ہوتا کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام طاہرہ بگڑتے نہیں۔ قرآن گواہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انتقال کے بعد کھڑے رہے۔ سال بعد دفن ہو گئے مگر نورانیت میں فرق نہ آیا تو جو رسول، حضرت سلیمان علیہ السلام کے بھی امام ہوں، ان کا جسم مبارک کیسے بگڑ سکتا ہے۔

☆...... حضور ﷺ کا جنازہ انور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ مبارک میں تھا۔ جہاں اب مزار مبارک ہے۔ اس سے باہر لے جانا نہ تھا۔ چھوٹا سا حجرہ اور تمام صحابہ کرام علیہم الرضوان کو اس صلوٰۃ وسلام سے مشرف ہونا تھا۔ ایک